سورہ کہف کی تفسیر کے تناظر میں
دجالی فتنہ
کے نمایاں خدوخال
تصنیف
حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی
تحقیق جدید
شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ
المیزان

سورہ کہف کی تفسیر کے تناظر میں

دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال

تصنیف

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی

حسن توجہ

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ

المیزان
ناشرین و تاجران کتب

[illegible] اردو بازار لاہور پاکستان فون [illegible]

المیزان

عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ

باہتمام محمد ادریس اعوان

فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيدِ ۝

تذکیر بسورۃ الکہف

یعنی

دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال

دجالی فتنہ جس میں قدرتی قوانین پر غیر معمولی اقتدار حاصل کر کے بنی آدم کو دین و مذہب سے اس اقتدار کے ذریعہ بیگانہ و لامذہب و باغی بنانے کی کوشش کی جائے گی اس فتنہ سے حفاظت کی ضمانت ارشاد نبوی ﷺ کے مطابق قرآن کی جس سورۃ میں بتائی گئی ہے اسی سورۃ کے مضامین و مشتملات اس فتنے کے آثار کو پیش نظر رکھ کر اس کتاب میں واضح کیے گئے ہیں۔

دجالی زندگی کس کو سمجھنا چاہئے اور اس سے کیسے بچنا چاہئے ان کے لیے اس کتاب میں ضرورت سے زیادہ کافی سرمایہ جمع کر دیا گیا ہے۔

فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ ۝

سید مناظر احسن گیلانی

دجالی فتنہ کے پیش نظر ہندوستان قدیم کی
دینی مدرسوں کو نئی معنوی بصیرت پیدا کی تھی 214
تعلیم جدید کا ایک عمومی اثر -------- 218
قصہ کی تاریخی تکمیل غیر ضروری ہے -- 221
ایک انتباہ -------------------- 225
(۲) قصہ ذوالقرنین ------------ 225
ذوالقرنین کی قومی خدمات -------- 226
قصہ کے نتائج یعنی فراخی حکومت --- 230
ذوالقرنین سکندر رومی نہیں -------- 236
(۳) یاجوج و ماجوج ------------ 236
ایک غلطی کا ازالہ -------------- 237
یاجوج و ماجوج کی خصوصیات ------ 240
لفظ سد کی تشریح ---------------- 242
کیا یاجوج ماجوج اولاد آدم نہیں؟ -- 245
یاجوج ماجوج کیوں مستحق سزا ٹھہرے 249
یاجوج ماجوج کے خروج کا زمانہ --- 253
ایک قرآنی اشارہ ---------------- 263
یاجوج و ماجوج کون ہیں؟ -------- 266
دعویٰ "مہدیت" و "مسیحیت" ----- 270
ایک مستند روایت --------------- 273
غالباً روسی یاجوج کی نسل ہیں اور برطانوی
ماجوج کی نسل ------------------ 274

باب ہشتم

یاجوج و ماجوج ------------ 276
اللہ کا محبوب کون نہیں ------------ 276
خدا کے بجائے بندوں پر اعتماد ----- 277
دنیوی حیات ہی کے لئے ساری دوڑ دھوپ
اور اس پر فخر ---------------- 283
انکار آیات اللہ و لقاء اللہ ------------ 284
اہل ایمان کے لئے بشارت ------- 291
کلمات اللہ کا مفہوم ---------------- 295
کام کی چند تحفے ---------------- 297
ازالہ شبہ ------------------- 298

اصحاب کہف جدید تحقیق کی روشنی میں

از مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ ------- 302

❖❖❖

(حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ) کی رائے عالی کو بھی تذکرہ اس کے
متعلق آپ نے کسی سابق مکتوب میں فرمایا تھا۔ ❶ مگر از کم اس سے اتنا معلوم ہوا
کہ سید صاحب اس کے مندرجات سے ناخوش نہ ہوئے تھے۔ ابتداء میں انہوں نے
مجھے لکھا تھا کہ "کہیں قدیم روایتوں کے مغالطوں کا شکار نہ ہو جانا" شاید ان پر واضح ہوا
ہوگا کہ ایسا نہیں ہوا"۔

اس سب کچھ ہو جانے کے بعد مجلس علمی کراچی کے بانی مولانا محمد موسیٰ میاں افریقی رحمۃ اللہ علیہ سے خود حضرت گیلانی ہی کے ذریعہ تعارف حاصل ہوا تو موصوف کی تحریک پر اس کتاب کی اشاعت پر بشوق آمادہ ہو گئے۔ اس لئے میں نے پھر یہ مسودہ حضرت گیلانی سے طلب کیا۔ جواب با صواب آیا۔

"سورۂ کہف والا مقالہ حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب (مہتمم دارالعلوم دیوبند) اپنے ساتھ لے کر چلے گئے ہیں ان سے طلب کروں گا اگر مولانا نے واپس کر دیا تو اس کو بھی ان شاء اللہ بھیج دوں گا۔ ایک خاص حصہ میں ترمیم کی بھی ضرورت محسوس ہوئی غالباً اسی مصلحت سے مولوی صاحب کو عدم اشاعت میں زیادہ دلچسپی ہے۔"

(اپریل ۱۹۵۵ء)

مسودہ حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحب مدظلہ کے ہاں سے فوراً آ گیا مگر جہاں تک نظر ثانی و ترمیم کا تعلق ہے ۲۷ اکتوبر کے گرامی نامہ میں مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ

"اتنی قوت بھی اس عرصہ میں پیدا نہ ہو سکی کہ ان دونوں کتابوں (تدوین فقہ اور سورۂ کہف) کی نظر ثانی کر لوں۔" ❷

---

❶ یہ خود راقم الحروف کو یہ خبر کہ ایا عرض خدمت کیا تھا۔ حضرت گیلانی کو حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کی رائے گرامی کا جو خیال ہوتا تھا حضرت علامہ کی وفات پر جو "نوحہ سلیمانی" حضرت گیلانی نے لکھا ہے اس میں ایک شعر یہ بھی ہے۔

اپنی تحریروں میں خود میری نظر تھی برسوں ۔۔۔ رائے کا تیری رہا دل کو ہمیشہ انتظار

❷ یہ تمام مکتوبات گیلانی بنام "بینات" کراچی بابت ذیقعدہ ۱۳۸۳ھ/اپریل ۱۹۶۴ء میں شائع ہو چکے
ہیں۔ ۱۴

آپ نے کی ہے اور جو مولانا گیلانی جیسے عمیق نظر، وسیع العلم، عبقری عالم اور ملت محمدیہ کی بدحالی کی امتزاج کا سوز و درد رکھنے والے خادم دین کی پیش کردہ توضیحات و تشریحات کی یہ افادیت کیا کم ہے کہ اس سے متجسس ذہن کی کئی الجھنیں دور اور فکر کی بہت سی سوچیں صاف ہو جاتی ہیں اور نگاہ کو نئی ایک سمت کی رہبری ملتی ہے جس سے وہ اب تک ناآشنا تھی نیز قرب قیامت کے موجودہ دور میں دجالی فتنوں سے ایمان کو بچا کر لے چلنے اور حفاظتی تدابیر پر فوراً کاربند ہونے کا خیال بلکہ عزم اہل ایمان میں پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ مولانا کا بڑا احسان ہے اور یقین ہے کہ ملت اسلامیہ کی طرف سے اس کے بدلے ان کو تاقیامت اجر بارگاہ شکوریت سے ملتا رہے گا۔

اللہ تعالیٰ اس تذکیر گیلانی کے ذریعہ اس ملت کو گمراہی سے محفوظ اور ہدایت پر قائم رکھے۔ آمین۔

والسلام علی من اتبع الہدیٰ

بندۂ ناچیز

غلام محمد

یکم دسمبر ۱۹ء

☆ ☆ ☆

دیباچہ

الحمد للہ وکفی والصلوٰۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

سورۂ کہف کے مطالعہ اور مراقبہ نے جن مضامین اور خیالات کی طرف ذہن کو منتقل کیا ہے وہی تحریری لباس میں آپ کے سامنے پیش ہو رہے ہیں۔ تفسیر یا تاویل کا اطلاق اگر اس پر صحیح ہو یا نہ ہو لیکن مستقل فن بن جانے کے بعد فن تفسیر کے لئے جو چیزیں ضروری قرار پا چکی ہیں یا قرآنی الفاظ کے واضح پہلوؤں کو ترک کر کے ایسے مطالب اور نتائج کو قرآن کی طرف انتساب جن کی طرف عام حالات میں آدمی کا ذہن مشکل ہی سے منتقل ہو سکتا ہے تاویل کا مطلب اگر یہی ہے تو مجھے یہ اعتراف کرنا چاہئے کہ جو کام آپ کے سامنے پیش ہو رہا ہے۔ اس نقطہ نظر سے نہ یہ تفسیر ہی کہلانے کا شاید مستحق ہو سکتا ہے ورنہ تاویل ہی کا اطلاق اس پر درست ہو سکتا ہے کیونکہ فن تفسیر کی اصطلاحی خصوصیات سے بھی یہ کتاب آپ کو خالی نظر آئے گی۔ اس میں نہ قصص ہیں نہ روایات اور نہ مفسرین کے اقوال ہی سے کتاب کی ضخامت بڑھائی گئی ہے۔ اسی طرح اپنا حسن ظن تو یہی ہے کہ کھلے کھلے صاف واضح نتائج قرآنی الفاظ سے چونکہ نکالے گئے ہیں اس لئے تاویل بھی ہم اس کو نہیں کہہ سکتے۔

بہرکیف ازالۂ اشتباہ کے لئے اپنی اس ناچیز خدمت کا نام بجائے تفسیر و تاویل کے احتیاطاً خاکسار نے "تذکیر بالقرآن" رکھ دیا ہے گویا تفسیر و تاویل کے مقابلہ میں "تذکیر" قرآنی خدمت کی ایک نئی قسم یا نئے پہلو سے آپ روشناس ہو رہے ہیں۔ سمجھنا چاہئے کہ اس ذریعہ سے لکھنے والا خود بھی چونکنا چاہتا ہے اور دوسروں کو بھی چونکنے کا مشورہ دے رہا ہے۔ "تذکیر" کے الفاظ سے اپنے اسی نصب العین کو واضح کرنا مقصود ہے۔ کہنا وہی ہے جو "میر مرحوم" کی زبان سے مدتوں پہلے کہا گیا تھا۔

خوشی ہے سب کو کہ آپریشن میں خوب نشتر یہ چل رہا ہے
کسی کو اس کی خبر نہیں ہے مریض کا دم نکل رہا ہے

ربنا انك تعلم ما نخفی و ما نعلن وما یخفی علی الله من شئی فی الارض ولا فی السماء

سید مناظر احسن گیلانی
گیلانی (بہار)
۲۳ اگست ۱۹۵۲ء

☆☆☆

باب اول

دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال

اور دیہاتی سے کہے گا کہ اے میرے بیٹے تم دجال کا ساتھ دو وہ اس کی پیروی کرو
یہی تمہارا رب ہے۔ (کنز العمال ص ۲۰۴ جلد ۲)

بہرحال قدرتی قوانین پر غیر معمولی اقتدار جو دجال کو عطا کیا جائے گا وہ بھی یا اسی قسم کی دوسری باتیں بھی ہیں جن کی تفصیل دجال کی متعلقہ حدیثوں میں پڑھی جا سکتی ہیں لیکن جہاں تک میرا خیال ہے دجال کو دجال بنانے والا اس کا وہ طرز عمل ہوگا جو اپنے اس غیر معمولی اقتدار کے استعمال میں وہ اختیار کرے گا۔

میرا مطلب:

یہ ہے کہ قوانین قدرت پر غیر معمولی اقتدار بجائے خود ایسی چیز نہیں ہے جو کسی کو دجال بنا دے بلکہ قرآنی تعلیم کی رو سے تو قدرت کے قوانین سے استفادہ نسل انسانی کے حق خلافت کا عین اقتضا ہے۔ آدم علیہ السلام کو اسماء کا جو علم بخشا گیا تھا اسی اجمال کی یہ تفسیر ہے۔ سوا اس کے کون نہیں جانتا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو بھی اسی قسم کا غیر معمولی اقتدار بخشا گیا تھا۔ علوی اجرام یا سفلی اجسام پر تسخیر کی مثالوں سے ان کی زندگی معمور نظر آتی ہے۔ سمندر کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ضرب عصا سے پھٹ جانا، شق القمر کا معجزہ جو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہے یا پھر خود قرآن میں ذکر کیا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اکمہ و ابرص کو چنگا بھی کرتے تھے بلکہ مردوں کو زندہ کرکے بھی دکھاتے تھے بہرحال پیغمبروں کی زندگی میں اس قسم کی چیزوں کی کیا کمی ہے مگر پیغمبروں کو یہی اقتدار جب بخشا گیا تو اپنے اس اقتدار سے جو کام وہ لیتے تھے اس سے دنیا واقف ہے یعنی اقتدار بخشنے والے قادر و توانا کے شکر سے ان کے قلوب بھی معمور ہو جاتے تھے اور دوسروں کو بھی اسی خدائے بخشندہ و مہربان کی طرف کھینچتے تھے۔ تسخیری مظاہر کو حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے سامنے پا کر فرمایا کرتے تھے۔

هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۖ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ۭ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ۔ (النمل آیت ۴۰)

”یہ میرے پروردگار کی مہربانی ہے مجھے وہ جانچتا ہے کہ میں اس کا شکر گزار ہوں یعنی

اس میں پائی جائے گی اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ مردوں سے آگے بڑھ کر عورتوں کو بھی متاثر کرے گا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

اخر من یخرج الیہ النساء حتی ان الرجل یرجع الی امہ وبنتہ واختہ و عمتہ فیو ثقھا رباطا۔

"دجال کے ساتھ آخر میں عورتیں بھی نکل پڑیں گی حالت یہ ہو جائے گی کہ آدمی اپنی ماں، بہن، بیٹی اور پھوپھی کو اس اندیشہ سے باندھے گا کہیں دجال کے ساتھ نہ نکل پڑیں۔"

بہرحال قدرتی قوانین پر غیر معمولی اقتدار کا غلط بلکہ قطعی معکوس استعمال یہی وہ "فتنہ" ہے جس میں المسیح الدجال خود بھی مبتلا ہو گا اور کوشش کرے گا کہ اس کی بھڑکائی ہوئی فتنے کی اس آگ میں دوسرے بھی جھونک دیئے جائیں۔ باقی یہ مسئلہ اپنی کرشمہ نمائیوں میں وہ کن ذرائع سے کام لے گا؟ ظاہر ہے کہ جب تک المسیح الدجال خود دنیا کے سامنے نہ آ جائے اس سوال کا صحیح جواب نہیں دیا جا سکتا۔ کیا سحر و جادو یا اسی قسم کے غیر مادی ذرائع پر اس کو قابو بخشا جائے گا؟ یا جیسا کہ حافظ ابن حزم مرحوم کا خیال ہے۔

ابن حزمؒ کا نقطہ نظر:

انما ھو صاحب یتحیل بحیل معروفة کل من عرفھا عمل مثلہ (الملل و النحل ص: ۱۰۲)

"دجال حیلوں سے کام نکالے گا ایسے حیلے جن کا علم جو بھی حاصل کرے گا وہی سب کچھ کر کے دکھا سکتا ہے جو دجال دکھائے گا۔"

جس کا حاصل یہ ہوا کہ ابن حزم کے نزدیک دجال "حیل" سے کام لے گا "حیلہ" لفظ کی جمع ہے۔ عام طور پر میکانکی طریقوں کی تعبیر عربی زبان میں "حیل" کے لفظ سے کی جاتی ہے۔ مثلاً جرثقیل کے طریقوں کا ذکر "حیل" کے ذیل میں کرتے ہیں "علم الحیل" نام ہی اس علم کا ہے جس میں میکانکی طریقوں سے چیزوں پر قابو حاصل کرنے کی تدبیریں بتائی جاتی ہیں اور یہی ابن حزم کا مقصود بھی ہے۔ انہوں نے دوسری جگہ "دجالی کرشموں" کا تذکرہ کرتے ہوئے بعض مثالوں سے "دجالی کرتبوں" کو سمجھانا چاہا ہے مثلاً لکھا ہے کہ اس کی نوعیت وہی ہو گی جیسے

یہی ہو سکتا ہے کہ بجائے خدا کے سب سے آخری اقتداری قوت کا مقام کسی بنی نوع انسانی کو تسلیم کر لیا جائے، مسئلہ ارتقاء جو مغربی طریقہ فکر کی تنہا مخصوص راہ ہے، یہی اس نتیجہ تک خود بخود سوچنے والوں کو پہنچا دیتا ہے، بلکہ انسانوں میں بھی یہی کہ آج ہر قسم کی طاقتوں اور قوتوں کا مرکز یورپ و امریکہ ہی بنا ہوا ہے، اسی "خدا" کے لفظ کا اطلاق خواہ مغربی تہذیب و تمدن کے نمائندوں پر نہ کیا جائے لیکن خدا اگر اسی طاقت کا نام ہے جس کے اوپر کوئی طاقت نہیں ہے تو آج ان دلوں کو چیر کر دیکھئے جو مغربی تمدن کی زیر اثر ہیں، ان کے اندر سے یہی عقیدہ اور احساس باہر نکل پڑے گا۔ یعنی یورپ و امریکہ والوں سے بڑا کوئی نہیں ہے، ان ہی پر سارے کمالات کی انتہا ہوتی ہے۔
جو کچھ اس تہذیب و تمدن کے متعلق لکھا پڑھا جاتا ہے اور جس قسم کی گفتگو یورپ کی اس نشاۃ جدیدہ کے متعلق عوام و خواص کی مجلسوں میں کی جاتی ہے، رسالوں، اخباروں، سینماؤں اور تھیٹروں میں جو کچھ سنایا اور دکھایا جاتا ہے، شعوری و غیر شعوری طور پر یہی اثر ان سے دماغوں اور دلوں میں جاگزیں ہوتا چلا جا رہا ہے، کوئی شک نہیں کہ یہ سب کچھ ہو رہا ہے، مگر بایں ہمہ جیسا کہ میں نے عرض کیا کھلے کھلے صاف لفظوں میں خدائی کا دعویٰ ابھی نہیں کیا گیا ہے، اور قوانین قدرت پر بھی ان کا اقتدار بلندی کے اس نقطہ تک ابھی نہیں پہنچا ہے، جس نقطہ پر حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ "المسیح الدجال" کا اقتدار پہنچ جائے گا، اس کی کوشش جیسا کہ سنا جاتا ہے ان ممالک میں ہو رہی ہے کہ مردوں کو زندہ کرنے کا راز بھی دریافت کر لیا جائے، ایسی خبریں بھی کبھی کبھی آ جاتی ہیں کہ بعض حیوانوں بلکہ شاید انسانوں تک کے متعلق احیاء موتی یعنی مردوں کو زندہ کرنے کا عمل کامیاب ہو چکا ہے، یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ بادلوں پر بھی قریب ہے کہ قابو پا لیا جائے، مگر انصاف کی بات یہی ہے کہ صحیح کامیابی جیسی کہ چاہئے اس راہ میں مغرب کی جدید تہذیب اور اس کی ارتقائی و صنعتی کوششوں کو ابھی نہیں ہوئی ہے اور اس کے سوا بھی ایسے مختلف وجوہ و اسباب ہیں جن کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ نبوت کی پیشین گوئیوں میں جس "المسیح الدجال" کا ذکر جن خصوصیتوں کے ساتھ کیا گیا ہے اس کے خروج و ظہور کا دعویٰ بھی قبل از وقت ہے، ہاں اتنی بات صحیح ہے کہ مغرب کا جدید تمدن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "المسیح الدجال" کے خروج کی زمین تیار کر رہا ہے، کیونکہ اپنی اقتداری قوتوں سے وہی کام یورپ کی اس نشاۃ جدیدہ میں

بھی لیا جا رہا ہے جس میں "المسیح الدجال" اپنی اقتداری قوتوں کو استعمال کرنے کا "خدا بیزاری یا خدا کے انکار کو ہر دلعزیز بنانے کی راہ یورپ صاف کر رہا ہے یا کر چکا ہے لیکن بجائے خدا کے خود اپنی خدائی کے اعلان کی جرأت اس میں ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ المسیح الدجال اسی قصے کی تکمیل کرے گا۔ کچھ بھی ہو صحیح اور صاف سچی بات جس میں خواہ مخواہ نبوت کے الفاظ میں کھینچ تان اور رکیک تاویلوں کی ضرورت نہیں ہوتی یہی ہے کہ "المسیح الدجال" کے خروج کا دعویٰ تو قبل از وقت ہے مگر "المسیح الدجال" جس فتنے میں دنیا کو مبتلا کرے گا اس قصے کے ظہور کی ابتدا کسی نہ کسی رنگ میں مان لینا چاہئے کہ ہو چکی ہے دوسرے لفظوں میں چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ دجال آیا ہو یا نہ آیا ہو لیکن "دجالیت" کی آگ یقیناً بھڑک چکی۔ آخر حدیثوں ہی میں یہ بھی تو آیا ہے کہ "المسیح الدجال" سے پہلے "دجاجلہ" کا ظہور ہوگا بعض روایتوں میں ان کی تعداد ۳۰ اور بعضوں میں ستر تک بتائی گئی ہے۔ "دجال" سے پہلے ان "دجاجلہ" کی طرف "دجالیت" کا انتساب بلاوجہ نہیں کیا گیا ہے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ "المسیح الدجال" جس فتنے کو پیدا کرے گا کچھ اسی قسم کے فتنوں میں اس سے پہلے ہونے والے "دجاجلہ" دنیا کو مبتلا کریں گے۔

اسی بنیاد پر میرا خیال ہے کہ "المسیح الدجال" کے زہر کا علاج جیسے بتایا گیا ہے کہ سورۂ کہف کی آیتوں میں پوشیدہ ہے اسی طرح اگر چاہا جائے تو ہر دجالی فتنے کے زہر کا ازالہ بھی اسی سورۃ کی آیتوں اور جن معارف و مضامین پر یہ آیتیں مشتمل ہیں ان میں تلاش کیا جائے چونکہ موجودہ مغربی تہذیب و تمدن جس کے زیر اثر دنیا کی اکثریت آ چکی ہے اور آتی چلی جا رہی ہے دجالی جرائم کا جیسا کہ دنیا دیکھ رہی ہے سرچشمہ بنی ہوئی ہے تقریباً وہی فتنے جن کے ظہور کی خبر "المسیح الدجال" کے عہد میں دی گئی ہے یورپ کی اسی تہذیب و تمدن سے ابل رہے ہیں۔

اسی حقیقت کو پیش نظر رکھ کر فقیر نے سورۂ کہف کے مضامین اور مشتملات میں جب غور کیا تو بعض حیرت انگیز نتائج سامنے آئے۔ شاید دوسروں کو بھی اس سے کچھ فائدہ ہو ان کو قلم بند کر لیا گیا آج ان ہی کی اشاعت کی سعادت حاصل کی جاتی ہے۔

واللہ ولی الامر و التوفیق۔

۱۔ اصحاب کہف کا قصہ۔

۲۔ علم لدنی اور خدا کے حضور سے علم و رحمت پانے والی ایک شخصیت سے موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات۔

۳۔ ذوالقرنین کا قصہ (اسی قصہ کے ضمن میں یاجوج و ماجوج کا ذکر بھی پایا جاتا ہے)

۴۔ دو آدمیوں کی مثالی سرگذشت اور مکالمہ جن میں ایک کے قبضہ میں قدرتی پیداوار کے حصول کے بڑے اہم ذرائع و وسائل تھے اور دوسرے کا دامن ان ذرائع و وسائل سے خالی تھا۔

۵۔ دنیا کی موجودہ پست زندگی کی ایک تمثیل۔

۶۔ آدم ملائکہ اور شیطان کے قصہ کا اعادہ بعض جدید اضافوں کے ساتھ۔

قرآنی قصص کی تاریخی تحقیق چنداں ضروری نہیں:

ان تمثیلی قصص و حکایات کو بیان کرتے ہوئے بعضوں کے شروع میں تو صراحتاً یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اس کا ذکر بطور مثال اور نمونہ کے لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے:

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ۔

"اور بیان کر بطور مثال کے دو آدمیوں کا حال"۔

یا دنیا کی اس پست زندگی کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ:

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔

"اور بیان کر ان کے لئے اس پست زندگی کی مثال"

دوسروں میں اس کی تصریح تو نہیں کی گئی ہے مگر سیاق و سباق اور قرآن کے شیوۂ بیان کے جو مذاق شناس ہیں وہ جانتے ہیں کہ کسی گزرے ہوئے واقعہ کا دہرانا یعنی افسانہ گوئی کا انتساب قرآن کی طرف خود اپنی عقل و تمیز کا مضحکہ ہے۔ اسی لئے قرآنی قصص و حکایات کی تاریخی جستجو کم از کم میرے نزدیک ایک غیر ضروری مشغلہ ہے۔ قرآن کا عام دستور ہے کہ بڑے بڑے تاریخی واقعات سے صرف ان ہی اجزاء کا وہ انتخاب کر لیتا ہے جن سے خاص مقصد کے ذہن

تلقین کرانے اور سمجھانے میں مددگار ہو۔ نہ صرف گزرے ہوئے واقعات و حوادث بلکہ جس
زمانے میں قرآن نازل ہو رہا تھا اور ایک عالمگیر دینی انقلاب کے متعلق جو واقعات مسلسل یکے
بعد دیگرے پیش آتے چلے جا رہے تھے ان کے ذکر کی بھی ضرورت کہیں اگر پیش آ گئی ہے تو اس
وقت بھی حسب دستور ذکر کے لئے ان ہی اجزا کو اس نے چن لیا جن سے اس خاص مقام
میں کسی قسم کا تعلیمی کام وہ لینا چاہتا ہے۔ بدر و احد جنگ جیسے اہم فیصلہ کن معرکوں کا تذکرہ آپ کو
قرآن میں اگر ملے گا بھی تو اسی نوعیت کے ساتھ جو عرض کیا گیا ورنہ بعض اہم واقعات مثلاً
شعب ابی طالب میں نظر بندی، ہجرت حبشہ، فتح خیبر اور اسی قبیل کی بیسیوں چیزیں ہیں اسی سلسلے کی
ایسی ہیں کہ ان کے ذکر سے ہم قرآن کو خالی پاتے ہیں یا ذکر ملتا بھی ہے تو اتنا مجمل کہ جب تک
واقعہ کے تفصیلات کا علم نہ ہو ان اجمالی اشاروں سے واقعہ کا علم نہیں ہو سکتا اور اس کی وجہ وہی ہے
کہ قرآن نہ قصے کہانی کی کوئی کتاب ہے اور نہ کوئی روزنامچہ یا یادداشت یا ریکارڈ ہے اس کا ایک
متعین موضوع ہے ❶ اسی لئے اس کے سارے مباحث اسی ایک موضوع سے خاص کئے گئے ہیں۔
جہاں جہاں مناسب تھا بعض گزرے ہوئے واقعات اور قصص کا بھی اس نے ذکر کیا ہے مگر
اسی التزام کے ساتھ یعنی صرف بقدر ضرورت اسی حد تک اپنے بیان کو محدود رکھتا ہے جس کی کسی
خاص مقام میں ضرورت ہوتی ہے اس لئے آپ دیکھیں گے کہ ایک ہی قصہ کا اعادہ مختلف
مقامات میں مختلف طریقوں سے قرآن میں جو کیا گیا ہے تو کہیں نسبتاً تفصیل و بسط کا رنگ پایا
جاتا ہے اور کہیں اسی قصے کے کسی خاص جز کا ذکر کرتے ہوئے آگے نکل جاتے ہیں۔ مجھے تو اپنے
تجربے کی بنیاد پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "ہڈی" جیسے ایک ہی ہوتی ہے مگر جسدی نظام میں وہی
"ہڈی" کسی جگہ کافی طویل و عریض موٹی نظر آتی ہے اور دوسری جگہ کی ہڈی بھی ہڈی ہوتی ہے مگر
ایک ڈیڑھ انچ سے زیادہ بڑی نہیں ہوتی۔ کچھ یہی طریقہ قرآنی القصص کے استعمال میں اختیار کیا
گیا ہے ایک ہی لکڑی ہوتی ہے جو مختلف چیزوں پر اسی ایک لکڑی سے کٹ کے بنا کر چپکائی

❶ یعنی جس کی منتہا "اهدنا الصراط المستقيم" کی دعا میں کی جاتی ہے جو سیدھی راہ جس پر چل کر
انسانیت قدرت و اس کے قوانین سے دعائی تعلق پیدا کر سکتی ہے قرآنی تعبیر جس کی "انعام" کے لفظ سے کی
گئی ہے۔

جگہ پر ان چھوٹے بڑے ٹکڑوں کو فٹ کرتا چلا جاتا ہے۔ قرآنی قصص کے متعلق ضرورت ہے کہ
قرآن پڑھنے والے اس خاص نقطۂ نظر کو اگر سامنے رکھیں گے تو ان پر قرآن کا ایک عجیب و غریب
اعجازی نظام واضح ہوگا۔

بہرحال مجھے کہنا یہ ہے کہ سورۂ کہف کے ان قصص و حکایات کی تاریخی تحقیق یعنی کہاں اور
کب یہ واقعات پیش آئے؟ تاریخی آثار اور کتابوں سے انہی کے متعلق کس قسم کے معلومات
فراہم ہو سکتے ہیں یا ہو چکے ہیں؟ یہ بالکل ایک جداگانہ بحث ہے، جیسا کہ میں نے عرض کیا، جس
غرض سے قرآن نے ان کا ذکر کیا ہے اس کے لحاظ سے بحث و تحقیق کے اس جھگڑے میں پڑنا غیر ضروری
ہے۔ یوں علمی نقطۂ نظر سے جیسے دوسرے تاریخی واقعات کی سراغ رسانی علم کی خدمت ہے، اس
خدمت کو بھی انجام دے تو علمی حلقوں میں یہ خدمت بھی قدر و قیمت کی مستحق ہوگی لیکن جس
نتیجے تک پہنچانے کے لئے قرآن کی روشنی عام کی گئی ہے اس کے لئے تو صرف قرآن ہی کافی
ہے۔ ❶

دجالی فتنہ کی بنیاد یعنی نظریہ ارتقاء:

بہرحال سب سے پہلی بنیادی بات دجالی فتنے سے مادّی فطرتوں کی آپ جانتے ہیں کیا
ہے؟ باور کرایا جاتا ہے جس کسی کو جو کچھ بھی ملا ہے اسی سے ملا ہے جس کے پاس خود کچھ نہ تھا،
یعنی کہ زندگی بھی اسی سے ملی جس میں زندگی نہ تھی، علم اسی سے ملا جس میں علم نہ تھا۔ الغرض
جس میں بینائی نہ تھی اس سے بینائی، جس میں شنوائی نہ تھی اس سے شنوائی، جس میں ارادہ نہ تھا
اس سے ارادہ، جس میں اختیار نہ تھا اسی سے اختیار و اقتدار سب کچھ تقسیم ہوا۔ یہی بنیادی
احساس ہے جسے ہر اس دل اور دماغ میں آج پائیں گے جس پر دجالی فتنے کے عفریت کا پ

❶ لیکن براہ راست عربی زبان میں قرآن سے جو استفادہ نہیں کر سکتے ان کو سمجھانے کا مرحلہ دشوار ہے۔
پہلے قرآنی الفاظ نقل کروں پھر ان کا ترجمہ کروں، مطلب بیان کروں اس کے بعد بتاؤں کہ دجالی فتنے کی مسمیت
کے ازالے میں سورۂ کہف کے اس جز سے مدد لینے کی کیا شکل ہے، دماغ میں مختلف تجویزیں آئیں گی مگر دیکھا کیا ہے
عاجز حق تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کر کے میں کچھ کہنا شروع کرتا ہوں آپ پڑھتے جائیے، دیکھئے اب اس سے
فائدہ کی صورت خدا چاہے گا تو نکل آئے گی۔

چھائیاں پڑ چکی ہیں۔ ان کے تاریک سائے میں آنے کے ساتھ ہی پانے والے کچھ اس قسم کے احساسات اپنے اندر پاتے ہیں۔

صرف ایک لفظ "ارتقا" جادو کا کوئی چھپے ہے جس میں بھر بھر کر وہ سب کچھ پلا دیا جاتا ہے جسے انسان کی فطرت کسی طرح پچے پر آمادہ نہیں ہو سکتی تھی، ہستی ہی سے ہستی کی پیدائش کا سلسلہ جن کے سامنے جاری ہے "کچھ نہیں" سے "کچھ" بھی پیدا ہو سکتا ہے، جو اس کے تصور سے بھی عاجز ہے، اسی غریب انسان کو ہضم کرا دیا جاتا ہے کہ کمالات وصفات کا یہ بحر بے کراں جو کائنات کے نباتاتی، حیوانی، انسانی طبقات میں ٹھاٹھیں مار رہا ہے ابتدا ءً یہ سب کچھ نیست و نابود تھے، پھر وہی کمالات جو نیست و نابود تھے ارتقائی عمل کی راہ سے ہست و بود کے قالب میں جلوہ گر ہوتے چلے گئے اور ہوتے چلے جا رہے ہیں، گویا جو نہ تھے وہ ہو گئے اور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہی منوایا بھی جاتا ہے اور ماننے والے اسی کو مان بھی رہے ہیں، جس خیال کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے اسی کے نگلوا دینے میں کامیابی کے لئے خصوصاً اس دعویٰ کے ساتھ کہ عقل و مشاہدہ کے سوا دلیل و حجت کی حیثیت سے کوئی تیسری چیز پیش نہیں ہو سکتی اس عقل و مشاہدہ کے برخلاف یہ کیسے مان لیا گیا کہ جس مادے میں کچھ نہ تھا اسی سے سب کچھ نکل آیا، حالانکہ نہ باور کرنے والوں کے سامنے کی یہ بات ہے اور نہ باور کرانے والوں کے سامنے کی۔ دنیا جب پیدا ہو رہی تھی اس وقت نہ یہ موجود تھے نہ وہ، مگر جانے بغیر جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم کسی چیز کو مان نہیں سکتے وہ ایک ایسے بنیادی مسئلہ میں جانے بغیر ماننے پر خود بھی تیار ہو گئے اور دوسروں کو بھی تیار کرنے کی کوششوں میں منہمک ہیں۔

بہر حال جس میں کچھ نہ تھا اسی سے یہ سب کچھ نکل آیا، صفر سے عدد کیسے پیدا ہوا، نابود نے بود کا، نیستی نے ہستی کا لباس کیسے اختیار کر لیا؟ ان قصوں کو تو جانے دیجئے، زیادہ تفصیل مطلوب ہو تو میری کتاب "الدین القیم" کا مطالعہ کیجئے، یہاں میں ایک دوسرے نفسیاتی مسئلہ کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ "جس مادے میں کچھ نہ تھا اسی سے سب کچھ نکل آیا" جس کی فکری تعمیر اس بنیاد پر قائم ہوئی، مادے کی کیچڑ سے اچھل کر باہر آنے والے اس شخص کے احساسات کیا ہوں

کتاب ان کے لئے پیدا کی گئی ہے مگر دجالی فتنوں کی آنچ سے پھلائی ہوئی ٹیڑھی ترچھی
ذہنیتوں اور عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالے ہوئے کج دماغوں پھرے ہوئے سروں سے یہ
کتاب اچٹ جاتی ہے۔ نہ وہ اس کے وزن کو محسوس کر سکتے ہیں اور نہ یہ کتاب اپنے واقعی وزن کو
انہیں محسوس کرا سکتی ہے۔ ان کے لئے جینیس سے انڈے اور انڈے سے روشن کل نکل سے
ساری دوڑوں کا نکلنا اور نکالنا آسان ہے۔ آخر جس ذرے میں کچھ نہ تھا جب یہ مانا جاتا ہے کہ
اسی سے سب کچھ نکل آیا تو اس میں اور جینیس کے مذکورہ بالا مشہور لطیفے میں کیا فرق ہے؟ جیسا کہ
میں نے عرض کیا تھا حضرت عمر کی پیدائش کا تو وہ تصور کر سکتے ہیں بلکہ اسی کو واقعہ ٹھہرا رہے ہیں
مگر جس ہتھیلی میں سو روپے نہ ہوں ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے دس یا بیس روپے کیسے نکلے؟
"الحمد للہ" کو خشت اول قرار دے کر قرآن کا خاتمہ کی تفسیر کی جو توجیہ پیش کر رہا ہے وہ اس
کے سوا اور کیا ہے کہ لامحدود کمالات والے خدا نے اپنے کمالات کو محدود پیمانوں پر نمایاں کیا۔ جو
کچھ نہ رکھنے والوں کو اسی سب کچھ رکھنے والے کے یہاں سے ملا ہے جو کچھ ملا ہے۔ مگر یہ شراب
سائنس اور گویا ارسطوئیت کے مفتون طبائع کے لئے دارو سے کم بنا ہوا ہے اور "کچھ نہیں" سے سب کچھ
نکل پڑنے کو نہ کی ارتقائی وسوسہ کو سارے فکری امراض کی دوا تسلیم کر لیا گیا ہے۔

خود جس مسئلہ میں الجھنوں کے کانٹوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے انہیں کانٹوں کی سیج پر انہیں
نیند آ گئی ہے اور یقین کئے بیٹھے ہیں کہ زندگی کے سارے دماغی سوالوں کی گرہیں الجھنوں کے
ان ہی کانٹوں کی نوک سے کھل چکی ہیں اور آئندہ کھلتی چلی جائیں گی اور یہ سب اسی لئے ہو رہا ہے
کہ پاؤں کو ٹیڑھا بنا لینے کے بعد ان کو نظر آ رہا ہے کہ ٹیڑھا جوتا ان کے لئے سیدھا بن گیا ہے مگر
ان کی ذہنیت اور فکر کی یہ مضحکہ خیزی جو ٹیڑھی بات کو اب سیدھی پا رہی ہے اور سیدھی باتیں ان
کو ٹیڑھی نظر آ رہی ہیں۔ یہ ایک مرض ہے جو باہر سے ان کے اندر آیا ہے شاید اسی کو بتانے کیلئے
اور اسی خارجی حیثیت کو نکالنے کے لئے دوسری خصوصیت اس "الکتاب" اور زندگی کے قدرتی
دستور العمل کی ایک اور صرف ایک "قیما" کے لفظ سے ظاہر کی گئی ہے۔ دیکھنے میں ہے تو بظاہر
یہ ایک لفظ جس کا حاصل یا ترجمہ جیسے کہ فقیر کا خیال ہے اور مفسرین کی کافی تعداد اس خیال کی
موید ہے یعنی علاوہ اس خصوصیت کے کہ اس کتاب اور اس کی تعلیمات میں کسی قسم کی کجی نہیں پائی

جنگ کا، سیرابی اور خوش حالی کے بعد قحط اور خشک سالی کا، امن و عافیت کے بعد وباؤں اور جنگوں کے مصائب کا، الغرض یہ یا اسی قسم کے سارے خطرات جو بنی آدم کی زمینی زندگی کے لئے روح فرسا دھمکیاں بنی ہوئی ہیں کیا ان سب کا سدباب ہو گیا؟ جب تک اس کی بشارت نہیں سنائی جائے گی، کیا جنت سے نکالا ہوا انسان صرف اس سے خوش ہو جائے گا کہ مرض کے بعد دوا کا، بھوک کے بعد کھانے کا، پیاس کے بعد پانی کا، پھٹنے کے بعد کپڑوں کا، بیمار پڑنے کے بعد دوا کا، مرنے کے بعد کفن و دفن کا، اس کے نظم کر دیا جائے گا؟ کسی نہ کسی شکل میں یہ سب کچھ تو اب بھی اس کو میسر ہے، لیکن زندگی کے چوبیس گھنٹوں میں اب بھی اس کے غم کی گھڑیاں مسرت کی گھڑیوں سے زیادہ ہیں۔ اور جب تک یہ سارے خطرات زمین کے اس کرے پر اسے دھمکاتے رہیں گے، اس وقت تک غم کے اوقات کا یہ اوسط مشکل ہی سے ختم تو کیا معنی، شاید کم بھی نہیں ہو سکتا۔

خیر میں کیا کہنے لگا عرض یہ کر رہا تھا کہ "قیم" کا یہ لفظ جس سے بندے پر نازل ہونے والی "الکتاب" کے مشتملات و تعلیمات کی خصوصیت ظاہر کی گئی ہے، لازوال غیر فانی حقائق کا یہ وہ مجموعہ ہے، تاریخ کے نامعلوم عہد سے جس پر انسانیت کی تعمیر و ترقی کی بنیاد قائم کرنے کی دعوت دی گئی۔ نوح نے بھی اسی کی طرف بلایا اور ابراہیم نے بھی، موسیٰ نے بھی اور عیسیٰ نے بھی علیہم السلام، سارے "النبیون" اور اللہ کے رسولوں نے ہر عہد اور ہر زمانہ میں زمین کے رہنے والوں کو اسی کی طرف پکارا، جس کے پاس کچھ نہیں ہے مگر سب کچھ کے پانے اور حاصل کرنے کی فطری آرزو اپنے اندر رکھتا ہے، چاہے کہ وہ آگے بڑھے اور جس کے پاس سب کچھ ہے اسی سے کچھ کچھ پانا چاہتا ہے پاتا چلا جائے۔ پہلوں کو جو "الکتاب" دی گئی اس میں بھی یہی تھا اور اسی "الکتاب" کی آخری شکل میں بھی اسی کی صلائے عام دی گئی ہے۔ ❶

---

❶ اشارہ سورۂ اعلیٰ کی آخری آیتوں کی طرف ہے بل تؤثرون الحیوة الدنیا والاخرة خیر و ابقی ان هذا لفی الصحف الاولی صحف ابراهیم و موسی (ع م)

ان کو کن امتیازی اوصاف سے پہچانا جا سکتا ہے؟

ان ہی تینوں سوالوں کا جواب بعد کی آیتوں میں دیا گیا ہے۔ اب میں آپ کے سامنے قرآنی الفاظ کی روشنی میں ان ہی تینوں سوالوں کے جوابوں کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔

کس چیز کی دھمکی دی گئی ہے؟ یہی پہلا سوال تھا دجالی فتنہ کی جن خصوصیتوں کو بیان کر چکا ہوں ذرا ان کو دماغ میں تازہ کر لیجئے میں تو سمجھتا ہوں کہ آپ کو بھی حیرت ہوگی کہ تیرہ سو سال پیشتر سرزمین عرب کی بیابانی آبادی میں اس پیشین گوئی کا اعلان الہامی امداد کے بغیر کیسے ممکن تھا؟ کلیدی لفظ جس کے سمجھ لینے کے بعد واقعہ خود آپ کے سامنے آ کر کھڑا ہو جائے گا وہ بأس کا لفظ ہے یوں تو لغت میں مثلاً قاموس کے فارسی ترجمہ "منتہی الارب" میں "بأس" کے لفظ کو لکھ کر حسب ذیل معانی درج کئے ہیں یعنی "بیم و عذاب و سختی و قوت و حرب و دلیری" مگر سارے معانی جو اس لفظ کے نیچے درج کئے جاتے ہیں قدر مشترک ان کا اگر نکالا جائے تو وہ یہی ہو سکتا ہے کہ فطرت انسانی میں ناگواری جن حالات و واقعات سے پیدا ہوتی ہے مختصر دوسرے الفاظ کے عربی میں اس کی تعبیر "بأس" بھی ہے گویا "بأس" کی لغوی تشریح ہے قرآن میں ایک سو سے زائد مقامات میں اس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے مثلاً عرب کے یہود کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ "بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ" یا عذابوں کے متعلق اس کا اعلان کرتے ہوئے کہ کبھی وہ اوپر سے آتے ہیں اور کبھی نیچے سے تیسری شکل اسی عذاب کی یہ بھی بتائی گئی ہے کہ مختلف ٹکڑیوں میں بانٹ کر "يُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ" کا منظر قدرت کی طرف سے قائم کر دیا جاتا ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ ایک کی چوٹ دوسرے کو لگائی جاتی ہے۔

اسی طرح سورۃ البقرہ میں صبر کرنے والوں کی تعریف کرتے ہوئے "حِينَ الْبَأْسِ" بھی فرمایا گیا ہے۔ الغرض یہ اور اسی قسم کے دوسرے مقامات میں "بأس" کے لفظ کی جو تفسیر کی گئی ہے اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حرب و قتال، جنگ و جدال کی وجہ سے جو دکھ اور تکلیف ازلی کے مرفریق کو پہنچتی ہے۔ قرآن اسی دکھ اور تکلیف کو "بأس" کہتا ہے۔ گویا یہ ایک قسم کا قرآنی محاورہ ہے اس محاورہ کو پیش نظر رکھئے اب سوچئے آگے سے ان قرآنی الفاظ کو جن کو فرمایا گیا ہے۔

"لِيُنْذِرَ بَأْسًا شَدِيدًا مِنْ لَدُنْهُ"

کے ارادے کے ساتھ وابستہ نہیں ہے ان کے تجربوں کا سلسلہ تو شاید اس وقت بھی باقی رہے گا
لیکن ان کے نتیجے بربادی تک پہنچ جائیں گے کہ

جتنا بچھڑو جال کے اندر
جال بچھے کھال کے اندر

یہ "من لدنی" عذاب کا دور ہوگا اس وقت اعوذ باللہ

"من لدنی" کے اعلان کے ساتھ وہ سامنے آ جائے گا اور ثابت کر کے بتا جائے گا کہ یہ
بھی جیسے ٹکنولوجی تاروں سے بھی زیادہ کمزور اسباب تھے کیا کام دیں گے مگر اسباب وعلل میں
جکڑی ہوئی اس دنیا میں جن کی نظر "مسبب" کی طرف سے نہیں ہٹی ہے کیا وہ "مسبب" کے
سامنے آ جانے کے بعد وہ بھی اسی طرح اپنے آپ کو بے سہارا محسوس کریں گے جیسے اغیار
"مسبب" والے اسباب میں پھنسے ہوئے لوگ اپنے آپ کو بے سہارا پائیں گے؟

"من لدنہ باساً شدیداً" کی دھمکی کے بعد اسی سوال کا جواب

وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ۔

"اور بشارت دیتا ہے ان ماننے والوں کو جو بھلے کام کرتے رہتے ہیں"

دیا گیا ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ براہ راست "مسبب" کا سامنا ہو جانا اس میں ان
کے لئے وحشت نہیں ہے جو شروع ہی سے

ہر لحظہ ہے [illegible]

کے یقین پر اپنا قدم جمائے ہوئے ہیں اسباب کی راہ سے جب چیزیں پیدا ہو رہی تھیں تو
ان کو بھی وہی پیدا کر رہا تھا اور آج اگر وہ اسباب کے حجاب کو اٹھا کر سامنے آ گیا ہے تو کچھ بھی
پیدا ہو گیا اسی کے ارادے سے اسی کے حکم اسی کے اذن سے پیدا ہوگا یہ "المومنین" کا گروہ ہو
گا جنہوں نے اس کو پہچانا اور مانا جسے خالق تعالیٰ نے اپنی مرضی سے آگاہ فرمایا تھا اور حکم دیا تھا
کہ اسی کی "مرضی" کے مطابق زندگی بسر کرنے کا مطالبہ ان لوگوں سے کیا جائے جو ہماری پیدا کی
ہوئی دنیا میں رہتے ہیں اور خود وہ بھی ہمارے ہی پیدا کئے ہوئے ہیں اسی کا نام "ایمان" ہے اور
خالق کی ظاہر کی ہوئی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام "عمل صالح" ہے۔

کے الفاظ میں دی گئی ہے۔ یعنی حق تعالیٰ یا مسبب الاسباب کی مرضی کے مطابق جینے کی کوشش جس اجر و معاوضہ کو پیدا کرے گی نہ ایسی چیزیں ہوں گی جو فطرت انسانی اور اس کے احساسات کے مطابق ہوں گی اور اپنی اپنی کوششوں کے اس معاوضے سے کوشش کرنے والے اس طرح مستفید ہوتے رہیں گے کہ مستفید ہونے کا یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا بلکہ "اجر" کے ساتھ "حسناً" کی صفت کا اضافہ جو کیا گیا ہے، یہ اضافہ بھی بلاوجہ نہیں ہے۔

ظاہر ہے مادہ اس لفظ کا "حسن" ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے کی مرضی کا علم حاصل کرکے جو اس پر اور اس کے نتائج پر غیر متزلزل یقین اپنے اندر پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے اور خدا کی ظاہر کی ہوئی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا عزم راسخ کر کے مر جانے کا قطعی فیصلہ کر چکے ہیں، وہ ایمان اور عمل صالح والی اس زندگی کے نتیجہ کو جس شکل میں اپنے سامنے پائیں گے جس کا سب سے بڑا نمایاں امتیاز حسن و جمال ہوگا، اور فطرت انسانی کا سچ پوچھئے تو سب سے بڑا مطالبہ یہی "حسن و جمال" ہے بھی۔

لہلہاتے ہوئے مرغزار، بہتے ہوئے پانی، ہرے بھرے باغ، کھلے ہوئے پھول، گدرائے ہوئے پھل، الغرض نباتی، حیوانی، انسانی یا ان سب کے سوا سارے کونی طبقات میں آدمی کی فطرت حسن ہی کی تلاش کرتی ہے، جمال ہی کی جستجو اس کی سرشت کا سب سے بڑا امتیازی سرمایہ ہے، جو نہ کھنڈروں میں پایا ہے، نہ گھونسلوں میں آفرینشوں کو نہیں، بچے بچے سے پوچھئے کس نے پایا ہے؟ کس بچے کو دیکھا گیا ہے کہ کسی "چڑیا" کو دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا ہو؟ اب جو بچہ ندی کے کنارے پہنچ کر اس کے دل میں گدگدی پیدا ہوتی ہو، اجر کے ساتھ "حسن" کے لفظ نے ذہن کو تو اسی "جمالی مظاہر" کی طرف منتقل کر دیا، جس کی قرآنی تعبیر "الجنۃ" سے کی گئی ہے۔

قرآن کی وہی "الجنۃ" جس میں فطرت انسانی کے سارے مطالبات کی تکمیل کی پوری پوری ضمانت کی گئی ہے، مگر دیکھئے کہ "دجالیت" کے اس عہد میں قرآن کی اس "جسمانی جنت" کے متعلق پھیلا دیا گیا ہے کہ یہ جسمانی مطالبات کی تکمیل کے سوا اور کچھ نہیں ہے، عیسائیوں نے پھیلایا ہے جن کا عقیدہ ہے کہ جو آدمی جان کر پیدا ہوا ہے، ایمان و عمل صالح کی زندگی اسی آدمی کو سارے انسانی احساسات سے معرا کر کے فرشتہ بنا دیتی ہے۔ سچ پوچھئے تو عیسائیوں کی یہ "روحانی"

منتقل کر دیتا ہے۔ ولد یعنی زید کی ذات اس کا وجود، وجود کے سارے لوازم و صفات، صفات کے ثمرات و نتائج ان میں سے کسی چیز کو اپنے والد عمرو سے زید نہیں پاتا بلکہ بقول شخصے والد کی حیثیت ولد کے حساب سے صرف ایک گزرگاہ کی ہوتی ہے جس سے اپنی ہستی کی ایک خاص منزل (یعنی عالم جوہریت یا نطفیت) میں ولد کو گزرنا پڑتا ہے۔ نیست کو ہست کرنا اگر خلق کے یہی معنی ہیں تو اس معنی کی رو سے قطعاً اپنے ولد کا کوئی والد خالق نہیں ہوتا۔ اور خلق کا ترجمہ اگر گھڑنا کیا جائے جیسے سنار سونے چاندی سے زیور گھڑتا ہے یا پتھر پر تراش خراش کا عمل کر کے بت تراش مجسمہ یا بت وغیرہ بناتا ہے تو اس معنی کی رو سے بھی ولد اپنے والد کی مخلوق نہیں ہوتا کیونکہ ولد میں صفات و کمالات کا جو سرمایہ پایا جاتا ہے اس میں والد کو جیسا کہ سب جانتے ہیں قطعاً دخل نہیں ہوتا۔ والد بے چارہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ جس نطفہ کو اس نے منتقل کیا وہ مرد بن کر پیدا ہوگا یا عورت بن کر اس کی ظاہری شکل و صورت کیا ہوگی اور باطنی صفات اس کے کیا ہوں گے؟ ظاہر ہے کہ جن چیزوں کو وہ جانتا ہی نہیں ان ہی کو وہ غریب بنا سکے گا کیا؟

اور یہ پہلی قابل غور بات ہے جو ولد کے اس خاص لفظ سے سمجھ میں آتی ہے، حاصل جس کا یہی ہوا کہ ولد ٹھہرانے کا مطلب یہی ہے کہ ولد اپنے والد کا مخلوق نہیں ہے، کسی معنی اور کسی حیثیت سے مخلوق نہیں ہے۔

اب دوسری بات جو اسی ولد کے لفظ کا قدرتی اقتضاء ہے اسے بھی سوچئے۔ آپ جانتے ہیں کہ گھوڑے سے جو چیز قانون ولادت کے تحت پیدا ہوگی وہ گھوڑا ہی ہوگی اور جیسے گھوڑے سے ہاتھی نہیں گھوڑا ہی پیدا ہوتا ہے یہی حال ہر اس چیز کا ہے جس میں والد و ولد ہونے کا تعلق پایا جاتا ہو۔ آخر بیل سے بچھو اور چوہے سے بچھیا، گدھے سے لومڑی کی ولادت کا تماشا کس نے دیکھا؟

یہ دونوں مقدمات جو بداہۃً بغیر کسی تاویل و توجیہ کے لفظ ولد سے سمجھ میں آتے ہیں ان کو سامنے رکھ لیجئے اور اب سوچئے کہ اللہ یعنی خالق عالم "تَعَالٰی عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا" کے لئے ولد ٹھہرانے والوں نے ولدیت کے اس دعوے کو اپنا عقیدہ بنا کر درحقیقت کیا مانا ہے اور اپنے دین و ایمان کی بنیاد انہوں نے کس چیز پر قائم کر رکھی ہے؟ یقیناً یہی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی

مجوسی عقیدہ کی حقیقت:

اس میں شک نہیں کہ الٰہیات یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ حق تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے مسائل میں طرح طرح کے شاخسانے مختلف زمانوں میں نکالے گئے شرک و بت پرستی اور انسانی بے شمار گوناگوں پیچیدہ شکلوں میں قومیں انہی شاخسانوں کی راہ سے الجھتی رہی ہیں مگر تاریخ کی شہادت یہی ہے کہ شرک کی بدترین شکلوں میں بھی اس کا یقین کہ اس عالم کا پیدا کرنے والا صرف ایک ہی ہے لوگوں سے کبھی نہیں نکلا تاریخ مذاہب کا جو طومار آج دنیا میں موجود ہے اس میں صرف ایران کا ایک فرقہ مجوسی نامی ہے متعلق اہرمن و یزدان یا نور و ظلمت کے عقیدے کو منسوب کرنے والے کہتے ہیں کہ بجائے ایک کے دو ہستیاں مجوسیوں کے نزدیک ایسی مانی جاتی ہیں جن میں کوئی ایک دوسرے کا خالق نہیں بلکہ کائنات کی بعض چیزوں کو کہتے ہیں کہ یزداں نے پیدا کیا ہے اور بعضوں کو اہرمن نے یا ان میں بعض نور سے پیدا ہوئی ہیں اور بعض ظلمت سے گو مجوسیوں کی طرف اس عقیدے کے انتساب کو محققین نے افترا قرار دیا ہے لیکن مان بھی لیا جائے کہ مجوسی کسی زمانے میں اس کے قائل بھی رہے ہوں تو کہ ان کی بات اتنی بودی اور ایسی تھی کہ عقل کی ذہنی چوٹ پہنچانے کیلئے کافی ہو سکتی تھی۔

ان کی طرف اس عقیدے کی تردید میں بڑی سے بڑی بات جو منسوب کی گئی ہے وہ یہی ہے کہ عالم کا موجودہ نظام خیر و شر یعنی بھلائیوں اور برائیوں سے بھرا ہوا ہے۔ پس خدا یا یزداں جو خیر مطلق ہے اس کی طرف کیسے منسوب کیا جائے کہ تمام شر اور برائیوں کا پیدا کرنے والا بھی وہی ہے؟ کہتے ہیں کہ ان ہی شر اور برائیوں کی پیدائش کی توجیہ کے لئے اہرمن کے وجود کا یزداں کے ساتھ اضافہ کیا گیا تھا مگر ذرا سوچئے بھلائی اور برائی کے جن صفات کو ہم دنیا کی چیزوں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ان کی واقعی حالت کیا ہے؟ دراصل ایک ہی چیز ہوتی ہے مثلاً آگ ہے جب تک ہمارا کھانا پکاتی ہے ہمیں روشنی بخشتی ہے تو ہم اس کو خیر ٹھہراتے ہیں مگر اسی آگ سے جب ہمیں کچھ نقصان پہنچتا ہے گھر جل اٹھتے ہیں جو بوریا اور ری جلنے لگتے ہیں تو اسی آگ کو ہم بدترین چیز ٹھہرانے لگتے ہیں۔ الغرض استعمال کے اختلاف سے ایک ہی چیز ہوتی ہے جو

کبھی خیر اور کبھی شر جنم دیتی ہے۔ غریب مجوسیوں نے خیال کرلیا کہ شر و خیر کے الفاظ جیسے الگ الگ ہیں اسی طرح درحقیقت میں بھی شر کا وجود خیر سے اور خیر کا وجود شر سے الگ ہو کر اس عالم میں پایا جاتا ہے۔ مگر اس لفظی مغالطہ پر متنبہ ہو جانے کے بعد کیا عالم کی ایک ہی چیز شر بھی جنم دیتی ہے اور خیر بھی؟ کیا ایک مخلوق کے لئے دو خالق کی تلاش کا جذبہ ان میں زندہ رہ سکتا ہے؟

خیر یہ قصہ تو بہت طویل ہے میں یہ بتانا چاہتا تھا کہ لے دے کر خیر و شر کا یہی لفظی صرف لفظی مغالطہ کچھ سہارا دے سکتا تھا لیکن اس سہارے کے ختم ہو جانے کے بعد آپ خود سوچئے کہ عالم کی پیدائش کے لئے ایک خالق کے مان لینے کے بعد عقل کے لئے ضرورت ہی کیا باقی رہتی ہے کہ خواہ مخواہ بلا کسی وجہ دوسرے فالتو خدا کو بھی تلاش کرے۔ ہاں! خدا کا وجود پیدائش عالم کی توجیہ کے لئے کسی حیثیت سے بھی اگر ناکافی ہو تو پھر اس وقت دوسرے خدا کی جستجو کا جواز بھی ذہن انسانی کے لئے کسی حد تک درست ہو سکتا تھا۔ مگر یہ بات کہ خدا کا وجود توجیہ عالم کے لئے ناکافی ہے آج تک نہ کسی نے ایسا دعویٰ کیا اور نہ کر سکتا ہے اور کوئی کر بھی گزرے تو اس دعویٰ کے لئے اسے قطعاً کوئی چھوٹی شکستہ و بریدہ دلیل بھی نہیں مل سکتی۔ توحید کے مسئلہ میں قرآن کو عموماً جو آپ دیکھتے ہیں کہ ہمیشہ دلیل کا مطالبہ مشرکین سے کرتا ہے۔ مثلاً "هاتوا برهانكم" یا "فأتوا بسلطان مبين" تو اس کا مطلب یہی ہے کہ شرک کے مقابلہ میں موحد کی حیثیت منکر کی ہے۔ مشرک خدا کے وجود کو گویا ناکافی ٹھہرا کر خدا کے ساتھ غیر خدائی قوتوں کا اضافہ کرتا ہے اس لئے وہ مدعی ہے اور قاعدہ ہے کہ بار ثبوت منکر پر نہیں ہمیشہ مدعی پر ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو قرآن نے یہی سکھایا ہے کہ مشرکوں کے مقابلہ میں تم ہمیشہ یہی کہا کرو کہ ہمیں تو خدا کے ساتھ دوسرے خدا کے اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

دراصل یہی وجہ ہے کہ "شرک" کی پوری تاریخ ایک سے زائد خالق کے ذکر سے خالی نظر آتی ہے۔ بحر و بر کے کونے کونے لوگوں نے چھان مارا مگر جہاں کہیں انسانی آبادی ملی وہاں خالق عالم کی توحید کا عقیدہ بھی ملا اور خالق کے سوا جن چیزوں کو بھی بنی آدم نے مختلف زمانوں میں پوجا پاٹ، معبودوں کا، دیوی دیوتاؤں کا استھان ان کو ٹھہرایا تو یہ مانتے ہوئے ٹھہرایا کہ وجود مخلوق ہونے کے زندگی کے مشکلات کے حل میں ان سے مدد ملتی ہے مگر یہی مغالطہ کی بنیاد بھی صرف

ایک لفظ کے سمجھنے پر موقوف ہے یعنی خود "مخلوق" کا لفظ۔

ربط خالق و مخلوق:

کسی ہستی جو مخلوق ہو، اس کے تعلق کی نوعیت اپنے خالق کے ساتھ کیا ہوتی ہے؟ یا اس تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہئے؟ لوگوں نے سامنے کی مثالوں کو دیکھ کر ایک رائے قائم کر لی اور یہی بے بنیاد رائے سارے مغالطوں کی بنیاد بنی ہوئی ہے یعنی ان کے سامنے یا تو ایسی چیزیں ہیں جن میں کوئی دوسرے کی مخلوق نہیں ہے مثلاً زید اور عمرو دو آدمی ہیں ظاہر ہے کہ نہ زید ہی عمرو کی مخلوق ہے اور نہ عمرو زید کا خالق۔ ہم اسی قسم کی چیزوں کو دیکھ کر فیصلہ کر لیتے ہیں کہ زید و عمرو دو ہستیوں کے تعلق کی جو نوعیت ہے بجنسہٖ یہی نوعیت یا اسی قسم کی نوعیت خالق و مخلوق کے تعلق کی بھی ہوگی یا زیادہ سے زیادہ ہم یہ سوچتے ہیں کہ اسی قسم کی چیزیں جن میں کوئی دوسرے کا خالق تو نہیں ہے لیکن ان میں صنعتی تعلق بھی جو پیدا ہو جاتا ہے جیسے پتھر کو صنعتی کاریگری سے بت تراش مجسمہ بنا لیتا ہے یا اینٹ چونے گچ کو جوڑ کر معمار مکان تیار کر لیتا ہے۔ لکڑی کے ٹکڑوں کو خراش و تراش کے عمل سے بڑھئی کرسی کی شکل میں ڈھال دیتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ صانع اور مصنوع میں جو تعلق اور رشتہ پایا جاتا ہے سمجھا جاتا ہے کہ خالق و مخلوق کے رشتہ اور تعلق کی نوعیت بھی یہی ہوگی حالانکہ یہی صورت ہو یا دوسری، خالق و مخلوق کے تعلق کے سمجھنے میں جب بھی ان سے مدد لی جائے گی تو حقیقت سامنے سے اوجھل ہو کر رہ جائے گی طرح طرح کی الجھنوں میں آدمی کا ذہن جکڑا پھنس کر رہ جاتا ہے جس کی وجہ کھلی ہوئی ہے کہ دنیا کی جن چیزوں میں صانع و مصنوع کا رشتہ پایا جاتا ہے کسی حال میں بھی ایک وجود دوسرے سے پیدا نہیں ہوتا۔ جن چیزوں میں صانع و مصنوع کا تعلق نہیں ہے ان کا حال تو ظاہر ہی ہے باقی خود صانع و مصنوع ہی میں دیکھئے پتھر یا لکڑی یا اینٹ چونہ وغیرہ جن پر صانع صنعتی عمل کرتا ہے ان میں کوئی بھی ایسا تھا کہ صانع اور کاریگر وجود اور ہستی عطا کرتا ہو یعنی نیستی سے ہستی یا جو چیز معدوم اور نیست مطلق تھی اس کا وجود اور ہستی کا لباس پہناتا ہو بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی چیزوں میں جو قدرتی صلاحیتیں پہلے سے پائی جاتی ہیں صانع اور کاریگر ان ہی صلاحیتوں کو اپنے صنعتی عمل سے ظاہر کر

دیتا ہے' پتھر میں بت بننے کی صلاحیت پہلے سے موجود تھی بت تراش اس صلاحیت کو فعلیت کا رنگ عطا کر دیتا ہے۔ آخر اپنے صنعتی عمل سے ہوا کے کسی ٹکڑے سے بت تراش بت بنا کر کیا دکھا سکتا ہے؟ وجہ وہی ہے کہ ہوا میں بت بننے کی صلاحیت ہی نہیں پائی جاتی' اسی لئے غلط مثالوں کا سہارا لے کر شعوری یا غیر شعوری فیصلہ بر محض خالق و مخلوق یا خدا اور عالم کے متعلق اپنے اندر رکھتا ہے' حالانکہ مثل نہ سہی' مثال اس کی آدمی کے باہر میں نہ سہی' اندر میں خود پائی جاتی ہے' یعنی خیالی قوت سے بحالت بیداری یا خواب جن خیالی چیزوں کو آدمی اپنے اندر پیدا کرتا رہتا ہے' کچھ ہلکی سی جھلک خالق و مخلوق کے تعلق کی اگر پائی جاتی ہے تو اسی خیالی مثال میں پائی جاتی ہے' تخیل کی قوت سے بغیر کسی مادہ کے جس وقت ہم کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتے ہیں تو پیدا کرنے کا صرف ارادہ اس خیالی مخلوق کی پیدائش کے لئے کافی ہوتا ہے۔ بڑی سے بڑی عمارت' پہاڑ' سمندر' آفتاب و ماہتاب کو عالم خیال میں آدمی پیدا کرتا رہتا ہے' گو یہ بھی ایک ہلکی سی ناقص مثال ہے مگر ذرا سوچئے کہ ان خیالی مخلوقات کا تعلق ان کے خالق سے کیا ہوتا ہے؟ اتنی بات تو کھلی ہوئی ہے کہ مخلوق بنا کر ہم جن چیزوں کو اپنے خیال میں پیدا کرتے ہیں' مثلاً دہلی کی جامع مسجد کا خیال کیجئے یعنی اپنے تخیل کی قوت سے اس کو پیدا کیجئے اور دیکھئے آپ کی یہ خیالی مخلوق اپنی ذات' اپنے صفات اور حالات ہر اعتبار سے اپنی پیدائش میں بھی آپ کے تخلیقی ارادے کی محتاج نظر آئے گی اور پیدا ہونے کے بعد بھی مسلسل اپنے قیام و بقا میں اس کی ذات بھی' اس کے صفات بھی' حالات بھی آپ کی تخلیقی توجہ اور التفات کے دست نگر دکھائی دیں گے' جب تک اپنے تخیل کی قوت سے آپ اس کے قیوم بنے ہوئے اور اسے تھامے ہوئے ہیں وہ موجود رہے گی اور جوں ہی توجہ و التفات کے اس سہارے سے وہ محروم ہوئی اسی وقت ناپید ہو کر رہ جائے گی۔

آدمی کی مخلوق کا حال جب یہ ہے تو اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ قادر و مقتدر واقعی عالم کا خالق حقیقی ہے اس کی مخلوقات کے احتیاجی تعلق کی نوعیت یقیناً اس سے بھی کہیں زیادہ شدید ہو گی۔ اس کی مخلوقات میں خود مخلوقات کا کچھ نہیں ہوتا سب کچھ خالق کا ہوتا ہے ان کا وجود بھی' ان کی ذات بھی' ان کے صفات بھی' ان کے افعال بھی' ہر لمحہ' ہر لحظہ مسلسل صرف خالق کے فیض توجہ کے ساتھ بندھے رہتے ہیں۔ "مخلوقیت" کا حقیقی ترجمہ یہی احتیاج مطلق ہے' جس پر "مخلوقات" کی

یہ حقیقت کھل جاتی ہے۔ وہ ان سے اس حد تک بے نیازی اپنے اندر پانے لگتا ہے کہ ان سے لین دین کے مراسم تو بڑی بات ہے ان مخلوقات کے وجود تک میں اس کو شبہ ہونے لگتا ہے اور شبہ کیا بعض تو اسی بات کے بعد چیخ اٹھے ہیں کہ ؎

گر او ہست حقا کہ من نیستم ❶

باوجود اجمال کے پھر بھی یہ ذیلی گفتگو کچھ زیادہ طویل ہو گئی۔ ورنہ یہ عرض کر رہا تھا کہ "مخلوق" کو مخلوق مان کر اس کو "معبود" بنانے کی غلطی تو دراصل اسی وقت تک شاید چل سکتا ہے جب تک کہ اس پر "مخلوقیت" کی اصل حقیقت صحیح معنوں میں واشگاف نہ ہوئی ہو مگر "خالق و مخلوق" کے باہمی تعلق کو سمجھ لینے کے بعد جب اس پر واضح ہو جاتا ہے کہ "مخلوقیت" دراصل خالص بے چارگی اور عدم سے تڑپتی ہوئی بے بسی کا نام ہے تو جن خیالی مغالطوں سے گھل کر شرک کی اندھیری کھائی میں وہ گر پڑا تھا ان سے اچک کر باہر نکل آتا ہے۔ آخر ایسے "معبود" کو وہ کب تک پوجتا چلا جائے گا جس کے متعلق جانتا ہو کہ وہ خود اپنے وجود اپنی ذات اپنے صفات اپنے افعال سب میں ہر پہلو اور ہر اعتبار سے دوسرے کا دست نگر اور دوسرے کے ارادے کے ساتھ جکڑا ہوا ہے۔

نظریہ "ولدیت" کی تنقیح:

اسی لئے شرک اور شرکیت کے وہ سارے قصے جن میں خالق کے سوا ہر معبود کو مخلوق مان کر معبود بنایا جاتا ہے ان کا مسئلہ چنداں دشوار بھی نہیں ہے مگر اتنا دشوار تو نہیں ہے جتنی دشواری "شرک" کی اس عجیب و غریب قسم کے وجہ سے پیش آتی جس کی بنیاد "ولدیت" کے عقیدے پر قائم ہے کہ اس میں خالق کے سوا ایک ایسی ہستی کو معبود بنا لینے کی کوشش کی گئی ہے جو مخلوق نہیں بلکہ (معاذ اللہ) خدا کا مولود ہے اور تماشا یہ کہ "مولود" مان کر یہی باور کرایا جاتا ہے کہ عیسائیت کا بھی بنیادی عقیدہ "شرک" نہیں بلکہ خالص توحید ہی ہے۔ حالانکہ آپ دیکھ چکے ہیں

❶ یہ بڑا تفصیل طلب مسئلہ ہے "مخلوقیت" کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے مسئلہ کے صرف ایک پہلو کا بیان تذکرہ کر دیا گیا۔ زیادہ تفصیل مطلوب ہو تو خاکسار کی کتاب "الدین القیم" ملاحظہ فرمائیے۔

کہ "ولد اللہ" اللہ کی مخلوقیت سے بھی باہر ہو جاتا ہے اور ولدیت کا لازمی اقتضا بھی ہے کہ اللہ کا ولد بھی (نعوذ باللہ) اللہ ہی ہو۔

اور قصہ یہیں اسی نقطہ پر ختم نہیں ہو جاتا۔ اب تک تو اس پر بحث کی گئی کہ "نظریہ ولدیت" کی بنیاد پر اللہ کے متعلق ماننے والوں کو کن کن باتوں کے ماننے پر مجبور ہونا پڑا۔ مگر دوسرا پہلو یعنی اسی "نظریہ ولدیت" کے متعلق ذات خود والد کی طرف کن کن اقتضائی امور کے منسوب کرنے پر اس کے قائل بے بس ہیں آپ اسے ملاحظہ فرمائیے۔

ظاہر ہے کہ ولد کا لفظ ولد کے ساتھ قدرتاً والدہ کے مسئلہ کو بھی ذہن کے سامنے لے آتا ہے جس کے بعد آپ آگے کیا عرض کروں؟ ہم جن کے ذکر سے کیا معنی! خیال سے بھی کانپ اٹھتے ہیں مگر ولدیت کے اسی حیرت انگیز بدترین گھناؤنے نظریہ کا یہ نتیجہ ہے کہ ماننے والوں نے ولد کے ساتھ اللہ کو باپ اور ولد کے ساتھ والدہ کو اور والدہ کے ساتھ (العیاذ باللہ) والدین کے سارے فرائض کو اپنے ایمان کا جز بنانے پر وہ مجبور ہوئے۔

یہاں تک تو مطلب ہوا حکمی آیت یعنی

"وَيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا" کا اب آگے پیچھے ارشاد ہوتا ہے۔

مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ۔

"نہیں ہے ان لوگوں کا کچھ بھی علم نہ ان کے باپ دادوں کو"۔

سوچئے قرآن کیا کہہ رہا ہے؟ کھلی ہوئی بات ہے کہ کسی چیز کے علم اور جاننے کی دو ہی صورتیں ہیں یعنی جاننے والوں کو براہ راست اس کا علم حاصل ہوا ہو یا براہ راست نہیں بلکہ بالواسطہ یعنی براہ راست جاننے والوں سے اس کی خبر پہنچی ہو۔ بالواسطہ بلاواسطہ علم کی یہی دو قسمیں ہیں۔ اب غور فرمائیے کہ "نظریہ ولدیت" یعنی بجائے مخلوق قرار دینے کے کسی شخص کو خالق عالم جل مجدہ کا "مولود" ٹھہرا لینا اور مولود ٹھہرانے کے بعد انسانیت کے اس متفق کلی فیصلے کے خلاف کہ خدا کے سوا جو کچھ بھی ہے سب مخلوق ہے بجائے اس کے ایک خاص ذات کو خدا کی "مخلوقیت" کے دائرے سے خارج کر دینا اور اللہ کے ساتھ ولد اللہ کا اضافہ کر کے درحقیقت ایک اور اللہ کو مان لینا پھر والد کے ساتھ والدہ بنانے کے لئے انسانی گھرانے کی ایک عورت

جس کا باپ نہ ہو اس کا باپ یقیناً خدا ہی ہے ایک بے بنیاد یا بلا دلیل وسوسے کے سوا اور بھی کچھ ہے؟

اور اب اس کے بعد انداز دیکھئے اس تیسری آیت سے صحیح قرآن کا جو مذکورہ بالا دو آیتوں کے بعد یعنی نظریہ "ولدیت" کے متعلق پڑھ لینے کے بعد کہ

"كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا"

"کسی قسم کے علم پر اس کی بنیاد قائم نہیں ہے قرآن نے بہت بڑی بات کی ہے جو ان
کے (عیسائیوں کے) منہ سے نکل رہی ہے انہیں بول رہے ہیں یہ مگر صرف جھوٹ۔"

کے پرزور الفاظ میں جو تنقید کی ہے کیا واقعہ کی صحیح تعبیر نہیں ہے اس سے بڑا دعویٰ خود سوچئے اور کیا ہو گا کہ ایک ایسی پادر ہوا بات جس کی قطعاً کسی قسم کی کوئی علمی بنیاد نہ تھی اور انسانیت کی ساری تاریخ میں جو کبھی سوچی نہیں گئی تھی اسی کو ان نصرانیات نے سارے تقاضوں کو درہم برہم کر کے رکھ دیا گیا۔

یقیناً حق تعالیٰ کے متعلق جتنی غلط سے غلط مہمل سے مہمل باتیں اب تک منسوب کی گئی ہیں ان میں سب سے بڑی بات وہ ہے جو نظریہ ولدیت کے معتقدوں کے منہ سے نکل رہی ہے اور کمال یہ ہے کہ حقیقت سے ذرہ برابر بھی لگاؤ ان کے اس ادعائی عقیدے کو نہیں ہے بالواسطہ یا بلاواسطہ علم کی کسی قسم کی تائید اس خیال کی یہ حاصل نہیں کر سکتے نہ خود اپنے خواب کی شہادت کو دلیل میں وہ پیش کر سکتے ہیں اور نہ اپنے باپ دادوں کی شہادت کو اور عقل سے تائید تو خیر بڑی بات ہے واقعہ یہ ہے کہ جس طریقے سے بھی سوچا جائے بجز تردید کے عقل کی رو میں بھی ان کو اور کچھ نہیں مل سکتا۔ اسی "نظریہ ولدیت" کا ذکر کرتے ہوئے قرآن ہی میں دوسری جگہ جو یہ ارشاد ہوا ہے۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا

(مریم، ۹۰)

"قریب ہے کہ اس سے (یعنی عقیدہ ولدیت کی وجہ سے) پھٹ پڑیں آسمان اور
ٹوٹ کے ٹکڑے ہو جائے زمین اور گر پڑیں پہاڑ کانپ کر۔"

تو جو نہیں سوچتے انہیں حیرت ہوتی ہے کہ اتنے بڑھے چڑھے الفاظ میں جن سے زمین و

آسمان بھی کانپ اٹھیں۔ آخر قرآن نے اس عقیدے کی تنقید کیوں کی ہے؟ بظاہر اسی قسم کے مقامات میں بداندیشوں کو شاعرانہ مبالغوں یا خطیبانہ اغراق کا دھوکہ ہوا کرتا ہے حالانکہ میرا تجربہ یہ ہے کہ خواہ الفاظ جتنے بھی بلند و بالا ہوں، ہاں پھر بھی "قرآن" حقیقت سے کبھی نہیں ہٹتا۔ الفاظ کی بلندی خبر دیتی ہے کہ حقیقت جس کی تعبیر الفاظ سے کی گئی وہ خود بھی اپنے اندر غیر معمولی بلندی رکھتی ہے۔

آسمان پھٹ جائیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ بکھر کر گر پڑیں۔

آخر میں پوچھتا ہوں کہ "نظریہ ولدیت" کے متعلق آپ بھی سن چکے کہ درحقیقت خدا کے ساتھ دوسرے خدا کے اضافہ کی یہ ایک مخفی تدبیر اور تعبیری چال ہے اور کون نہیں جانتا کہ خدا کے ساتھ خدا کے اضافہ کا مطلب جیسا کہ خود قرآن میں بھی اعلان کیا گیا ہے کہ آسمان و زمین کے فساد اور بگاڑ کے نتیجہ کو یہ صورت حال پیدا کرتی ہے۔

پھر مندرجہ بالا الفاظ میں بجز اس کے کہ اسی لزومی منطقی نتیجہ کو دہرایا گیا ہے اور بھی کچھ کیا گیا ہے؟ یعنی خدا کے ساتھ دوسرے خدا کا وجود نظام عالم کی تباہی کو مقتضی ہے۔ اس اجمالی دعوی کے فنی تفصیلات تک عوام کی رسائی تو ذرا دشوار ہے مگر ایک سیدھی سادی بات کہتا ہوں۔ ابھی آپ کے سامنے خالق و مخلوق کے تعلق کو مثال سے سمجھاتے ہوئے عرض کیا گیا تھا کہ تخیل کی قوت سے مخلوقات کو ہم اپنے خیال میں جو پیدا کرتے ہیں منجملہ دوسری باتوں کے دیکھئے کسی کرسی پر آپ بیٹھے ہوں اور اسی حال میں اپنی خیالی مخلوق کو پیدا کیجئے۔ آپ پائیں گے کہ آپ کی خیالی مخلوق کا وجود اور آپ کا وجود دونوں ایک ہی کرسی یا مکان میں سما گئے مگر اسی کرسی میں ایسی چیز جو آپ کی مخلوق نہ ہو مثلاً زید بھی اسی حال میں بیٹھنا چاہے جب آپ اس پر بیٹھے ہیں تو یقیناً ایک مکان میں ایسے دو مکینوں کا جمع ہونا ناممکن ہے۔ دونوں صورتوں میں فرق کیا ہوا؟ یہی تو کہ ثانی الذکر شکل میں دونوں میں کوئی کسی سے مخلوقیت کا تعلق نہیں رکھتا تھا۔ برخلاف اول الذکر صورت کے کہ آپ کی حیثیت خالق کی تھی اور خیالی مخلوق جسے تخیل کی قوت سے آپ نے پیدا کیا تھا آپ کے مخلوق ہونے کی حیثیت رکھتی تھی خواہ اب آپ کی یہ مخلوق جتنی بھی عریض و طویل ہو ہمالیہ کا پہاڑ کیوں نہ ہو لیکن مخلوق بن کر اسی کرسی میں اس کی گنجائش نکل آئی جس پر آپ بیٹھے تھے اب اسی

پڑتا تھا اور نہ جذبات ہی کو ٹھیس لگتی تھی مگر انہوں نے نہ عقلی احساسات ہی کی پروا کی اور نہ جذباتی تاثرات کا خیال ان کے آڑے آیا اور ایک ایسا دعویٰ کر بیٹھے جس سے آپ دیکھ رہے ہیں کہ کیسے عجیب و غریب تماشے پیدا ہوئے۔ پیش ہونے کے ساتھ ہی عقل جس خیال کو قے کر دیتی ہو جذبات میں جس سے طوفانی ہیجان پیدا ہو جائے اسی کو وہ خود بھی اگلنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو نگلوانا چاہتے ہیں۔ پھر قرآن اگر یہ کہتا ہے کہ بہت بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ یا ایسی بھاری بات جو نہ کبھی سنی گئی اور نہ دیکھی گئی یعنی لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا تو انصاف شرط ہے کہ جس چیز کو انہوں نے مانا ہے اس کی صحیح تعبیر کے لئے اور کیا کہا جاتا؟ اور یہ تو خیر "نظریہ ولدیت" کی وہ باتیں ہیں جو "ولدیت" کے اس لفظ سے

(گزشتہ سے پیوستہ) "مریم نے فرشتے سے کہا کہ یہ کیونکر ہوگا کہ جب کہ میں مرد کو نہیں جانتی؟ اور فرشتے نے جواب میں اس سے کہا کہ روح القدس تجھ پر نازل ہوگا اور خدا کی قدرت تجھ پر سایہ ڈالے گی" لوقا ۱: ۳۴، ۳۵

یہی نظریہ جس کا حاصل قرآن میں بھی پایا جاتا ہے اسی سے توسط کی تلاش کی بعض نے یہاں کو عیسائی چاہتے تو بچا سکتے تھے یعنی والدہ تو ان کی مریم (علیہا السلام) موجود ہی تھیں اور روح القدس جس کے نزول کا ذکر انجیل میں کیا گیا ہے اس کا نتیجہ جو ایک مخلوق کی شکل ہے اسی میں ان کو وہ چیز مل سکتی ہے جسے چاہیں تو والدیت کا قائم مقام مان سکتے تھے بلکہ اسلامی صوفیوں نے جو یہ لکھا ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کا وجود بشریت و ملکیت کا ایک برزخی قالب تھا ماں کی طرف سے وہ بشر تھے اور فرشتہ یا روح القدس یا جبرائیل اور ان کے نفخ نے حضرت مسیح (علیہ السلام) میں ملکوتی شان پیدا کر دی تھی انہوں نے لکھا ہے کہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی فہم و ادراک عقل و تمیز کی قوت جو مسیح (علیہ السلام) میں پیدا ہو گئی تھی اور انی عبد الله اتانی الکتب و جعلنی نبیا کے الفاظ گہوارے ہی میں ان کی زبان پر جاری ہوئے تو یہ درحقیقت کا نتیجہ ہے۔ برخلاف ان بچوں کے جو بشری والدین کے توسط سے پیدا ہوتے ہیں ان کی روح ماں باپ دونوں کی طرف سے مادی پردوں میں دبی ہوتی ہے۔ اسی لئے روحانی قوتوں کی بیداری کے لئے کچھ مدت درکار ہوتی ہے مگر مسیح (علیہ السلام) پر صرف ماں کی طرف سے ہلکا سا مادی پردہ چڑھا ہوا تھا اسی لیے اس مدت کی ضرورت ان روحانی قوتوں کی بیداری کے لیے پیش نہ آئی بلکہ بشری والدین سے پیدا ہونے والے انسانوں کی بقا کا جو عام قدرتی قانون ہے اس سے بھی حضرت مسیح (علیہ السلام) کو جو مستثنیٰ سمجھتے ہیں تو اس کی توجیہ بھی یہی ہے کہ وہ پورے آدمی ہی کب تھے بلکہ جیسے بے شمار فرشتے جبرائیل میکائیل وغیرہ جس طرح زندہ ہیں۔ کچھ اسی قسم کی کیفیت مسیح (علیہ السلام) کی زندگی کی بھی ہے مگر تھوڑا سا بشری عنصر ان کی طرف سے بھی ان کے اندر چونکہ شریک تھا اس لئے بالآخر بشری موت کا قانون آخر میں ان پر نافذ ہوگا۔

اس طرح "بـخـع الـر كـيـة" اس وقت بولتے ہیں جب کھودتے ہوئے زمین کے اس طبقہ تک آدمی پہنچ جائے جہاں سے کنویں کا پانی ابلنے لگے۔ بہرحال کسی معاملہ میں جدوجہد کو اس کے آخری حدود تک پہنچا دینا بخع کا عربی لفظ اسی مفہوم کو ادا کرتا ہے۔

تیسرا لفظ اسف کا ہے غم واندوہ اس کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ غم واندوہ حزن وملال کی ایک تو عام کیفیت ہوتی ہے لیکن یہی کیفیت جب شدت اور تیزی کی آخری شکل اختیار کر لیتی ہے جس کے بعد قلبی کلفت اور بے چینی کا کوئی درجہ سوچا نہیں جا سکتا تب اسف کے لفظ سے قلب کی اس کیفیت کا اظہار کیا جاتا ہے اسی لئے ایسی زمین جس میں روئیدگی کی صلاحیت قطعی طور پر باقی نہ رہی ہو ایسی زمین کو ارض اسفعہ کہتے ہیں۔

ان لغوی تشریحات کو سامنے رکھتے ہوئے سیدھے اور سادہ الفاظ میں مندرجہ بالا آیت کا خلاصہ یہی ہو سکتا ہے کہ قرآن پر ایمان لا کر قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اپنے علم وعمل کی تصحیح سے عیسائی قوم اگر محروم رہ گئی ہے تو قرآن یہ نہیں کہہ رہا کہ ان عیسائیوں پر افسوس کرتے ہوئے تم اپنے آپ کو ہلاک کر دو گے بلکہ جن آثار ونتائج اور عواقب کو ولدیت کا عقیدہ رکھنے والی یہ قوم دنیا میں چھوڑ کر جانے والی ہے ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ کو مخاطب بنا کر یہ پوچھا جا رہا ہے کہ ان کو سوچ سوچ کر کیا اپنے آپ کو ہلاک کر دو گے؟

یہ ہے حاصل اور خلاصہ قرآنی الفاظ کا۔ اب ظاہر ہے کہ قرآن میں العیاذ باللہ شاعری تو نہیں کی گئی ہے بلکہ جو حقیقت تھی صحیح صحیح نپے تلے الفاظ میں اسی کا اظہار کیا گیا ہے اور اسی واقعہ سے آگاہی بخشی گئی ہے۔

پس آنحضرت ﷺ کی یہ نفسیاتی کیفیت یعنی غم والم کا ایسا طوفان آپ کے اندر امنڈ رہا تھا کہ اپنا سب کچھ حتیٰ کہ اپنی زندگی تک کو قربان کرنے کے لئے آپ آمادہ تھے اگر یہ واقعہ تھا اور واقعہ کے سوا کسی دوسرے پہلو کا احتمال ہی کیا ہے تو سوال یہ ہوتا ہے کہ "عقیدہ ولدیت" کے وہ مہیب روح فرسا جان گداز نتائج کیا تھے جن سے رسول اللہ ﷺ اس حد تک متاثر تھے یقیناً وہ چلتی پھرتی کوئی معمولی بات نہیں ہو سکتی اور اسی لئے میں نے عرض کیا کہ اس آیت میں سب سے زیادہ توجہ طلب کا مستحق "اثارھم" کا جزو ہے اور اب میں اسی "اثارھم" کی تھوڑی بہت تفصیل

کرنا چاہتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ اظہار اور ھم ان ہی دو لفظوں میں درحقیقت نسل انسانی کے ایک خاص طبقہ کی کتنی طویل و عریض تاریخ بند ہے۔

مطلب یہ ہے کہ "عقیدہ ولدیت" یا کسی مخلوق کا بیٹا ٹھہرانا خواہ آدمی کے عقلی اور جذباتی اقتضاؤں کے لئے جس حد تک بھی قابل برداشت ہو دماغ سے بھی ٹکرا کر یہ خیال واپس ہو جاتا ہو اور دل بھی اسے اگل دیتا ہو "کلمۃ تخرج من افواھھم" ایک بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے اس میں "افواہ" یعنی منہ کی طرف سے اس عقیدے کو جو منسوب کیا گیا ہے اس میں بھی بظاہر اسی کی طرف اشارہ ہے کہ اس عجیب و غریب دعویٰ کا رشتہ نہ دل سے ہے اور نہ دماغ سے بلکہ دعویٰ کرنے والوں کے منہ صرف منہ سے ایک بات نکلی ہے ابتداء بھی اس کی منہ سے ہے اور انتہا بھی منہ سے آگے اس کی نہیں ڈھونڈی جا سکتی۔

مگر کیا کیجئے جب آدمی طے ہی کر لیتا ہے کہ ہم کسی چیز کو بہرحال مان ہی کر رہیں گے تو کوئی نہ کوئی ماؤ دل کی تسلی کے لئے نکال ہی لیتا ہے۔ مذہب کے متعلق اتنی بات تو بہرحال مسلم ہے کہ حواس و عقل کے حدود جہاں ختم ہو جاتے ہیں وہیں سے رہنمائی کا فرض مذہب ادا کرتا ہے یا یوں کہئے کہ فطرت انسانی کے جن بنیادی سوالوں کے جواب عقلی حدود سے باہر ہیں ان کے حل کا ذمہ دار مذہب ہے۔

یہ ایک واقعہ ہے اور مذہب کی ضرورت اس کے اسی فرض کی بجا آوری میں پوشیدہ ہے اسی واقعہ کی تعبیر میں عموماً کہنے والے اسی قسم کی باتیں کہہ دیتے ہیں کہ "مذہب اور دین وراء عقل ہے" یعنی عقل سے بالاتر حدود کے سوالوں کے جواب سے اس کا تعلق ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا اور نہ ہے کہ بشری جبلت کی بے چینیوں کی تسکین کا جو سامان اپنے پیش کردہ جوابوں سے مذہب مہیا کرتا ہے یہ ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کے ماننے کی گنجائش آدمی کی عقل اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتی، دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ جبلت کی جس پیاس کا پانی یا جس بھوک کی غذا فراہم کرتا ہے یہ ایسا پانی یا ایسی غذا ہوتی ہے جس کے تصور ہی سے عقل اور جذبات میں غثیان اور ابکائی کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے یہ صحیح نہیں ہے۔

بہرحال زندگی کے جن بنیادی سوالوں کو ہم مذہب کی روشنی میں حل کرتے ہیں واقعہ یہ ہے

بظاہر عیسائی دنیا کلیسا کی اس چھاؤں کے نیچے پلتی ہوئی بھی باقی تھی لیکن درحقیقت وہ ان جڑوں میں جکڑی ہوئی تھی جو اندر ہی اندر چھوٹی اور بڑھتی ہوئی زنجیروں لوہے کی زنجیروں کی طرح سر سے پاؤں تک عیسائیوں کے ظاہر و باطن کے ساتھ چمٹ گئی تھی۔

"کلیسا" کا قیام کیسے قائم ہوا؟ ابتداء اس کی کس شکل میں ہوئی یہودیوں یا اولاد اسرائیل کے محدود دائرے سے نکال کر عیسائیت کے پیغام کو یورپ کی غیر مختون غیر اسرائیلی قوموں میں پہنچانے میں تدبیر کرنے والوں نے کن کن گھٹیا و گندی تدبیروں سے کام لیا؟

شاول جس کا نام بعد کو پولس اور آج کل سینٹ پال ہے یہ شخص کون تھا؟ ایشیائے کوچک کے صوبہ کلیکیہ کے شہر ترسس اپنے مولد سے یہ فلسطین کیسے پہنچا اور وہاں یہودی علماء کے وفادار شاگرد کی صورت اختیار کرکے مسیح کے ماننے والوں پر مظالم کے پہاڑ پہلے جو اس نے توڑے اور آخر میں عیسائیوں کو ستانے کے لئے ہیکل کے یہودی علماء کے تصدیقی خطوط لے کر جب وہ دمشق جا رہا تھا تو اچانک اس کا یہ دعویٰ کہ مسیح علیہ السلام کی روح اس پر تجلی ہوئی اور یہ آواز آئی۔

"اے شاول! اے شاول تو مجھے کیوں ستاتا ہے"

پھر جیسا کہ اس کا بیان ہے اس کے یہ پوچھنے پر اے خداوند تو کون ہے؟ یہ جواب ملا کہ:

"میں یسوع ہوں جسے تو ستاتا ہے مگر اٹھ شہر میں جا اور تجھے جو کرنا چاہئے وہ تجھ سے کہا

(گزشتہ سے پیوستہ) راست بازی کے حاصل کرنے کے اس طریقہ کا نام "مفت کی راست بازی" رکھا گیا۔ سینٹ پال کے اس خط میں ہے۔

"اس مخلصی کے وسیلے سے جو یسوع مسیح میں ہے "مفت راست باز" ٹھہرائے جاتے ہیں" تو یہ بھی ہوتی ہے کہ

"اسے (یعنی یسوع مسیح) کو خدا نے اس (یسوع مسیح) کے خون کے باعث ایسا کفارہ ٹھہرایا ہے جو ایمان لانے سے فائدہ مند ہو" (رومیوں کے نام سینٹ پال کا خط باب ۳)

کہا جاتا تھا کہ ایک گناہ کی دو سزائیں خدا کی طرف سے نہیں مل سکتیں اپنے ماننے والوں کے جرم کی سزا مسیح جب ایک دفعہ صلیب پا کر سزا بھگت چکا تو ماننے والوں اور مسیح پر ایمان لانے والوں کو ان کے انہیں گناہوں کی سزا دوبارہ کیسے دی جا سکتی ہے یہی کفارہ کا مسئلہ ہے۔ مسیحی دنیا میں یہ مانو جواب بھی میں کیا گیا کہ نجات پاؤ کے مسیح یسوع پر ایمان لاؤ تو بچ جاؤ گے" ایک عام زبان زد فقرے کی حیثیت سے مشہور ہے۔

جائے گا۔ (اعمال ۹: ۵/۵)

پھر یہ جانے دشمن کے مسیحیت کا مبشر اور منادی کرنے والا وہ کیسے بن گیا؟ کہاں کہاں پھرا اور آخر میں یہ عہد شاہ نیرو رومیوں کے دارالسلطنت "رومۃ الکبریٰ" میں قیدیوں کی شکل میں وہ کیسے پہنچا؟ وہیں وہ مارا گیا' دفن ہوا' پھر اس کے مدفن اور اس کے ساتھ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواری پطرس ❶ کی جعلی قبر کا دعویٰ کر کے روم میں عیسائیت کا مرکز کیسے قائم کیا گیا' جس نے آخر میں "کلیسائے روم" کا نام پایا۔ اور اس روی کلیسا کی اجتماعی طاقت کا شخص مظہر یا اقتدار اعلیٰ پوپ کے نام سے گدی پر کیسے آ گیا؟ پھر ایک کے بعد ایک اسی طرح پوپوں کی جانشینی کا سلسلہ شروع ہوا' رفتہ رفتہ بالآخر کلیسائے روم کے پوپ کا اقتدار مطلق' اور اس کے غیر محدود اختیارات عروج کے اس نقطہ تک پہنچ گئے کہ ان کے آگے عوام تو عوام سلاطین اور بادشاہوں کی بھی نہیں چلتی تھی' یورپ کے عیسائیوں کی جان ومال' عزت وآبرو کے مالک پوپ اور پوپ کے وہ نمائندے تھے جو اس ملک کے طول وعرض میں گرجے بنا بنا کر کیڑوں کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ سب کماتے تھے اور وہ کھاتے تھے۔

یہ سارے سوالات ایسے ہیں جن کے جواب کے لئے ہزار ہا ہزار صفحات کی ضرورت ہے' تفصیل کے لئے تو یورپ کی عام تاریخ اور کلیسائے روم کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہئے' لیکن بطور نمونہ چند تاریخی شواہد کا پیش کر دینا غالباً ان لوگوں کے لئے مناسب ہوگا جنہوں نے "دین صلیبی" اور یورپ جس صورت حال سے اس دین میں داخل ہونے کے بعد دوچار ہوا' ان باتوں کی تاریخی تفصیلات کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔

---

❶ کلیسائے روم کی عظمت کا زیادہ تر دارومدار مدت تک پطرس کا مصنوعی مدفن تھا' لیکن حال میں اس خیال کو غلط ٹھہرایا گیا ہے' اب سمجھا جاتا ہے کہ پطرس عراق اور ایران کے درمیانی علاقوں میں عیسائیت کا پرچار کرتے ہوئے کہیں مر گیا' سینٹ پال اور پطرس میں اختلافی نقطہ نظر یہ تھا کہ پال کے نزدیک "صرف مسیح کو خدا کا بیٹا مان لینا" محض یہی نجات کے لئے کافی ہے' لیکن پطرس موسوی شریعت کے احکام کی تعمیل کو بھی ضروری قرار دیتا تھا۔ جرمنی کے ارباب تحقیق کچھ دن ہوئے اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ سینٹ پال کی ساختہ پرداختہ عیسائیت حضرت مسیح علیہ السلام کی پیش کردہ عیسائیت سے مختلف تھی اور یہ اختلاف شروع ہی سے چلا آ رہا تھا۔ (دیکھو تاریخ بائبل ہلکی ترجمہ طالب الدین ص: ۵۱۸)

مختصر یہ ہے کہ تقریباً تین سو سال تک تو سینٹ پال کا پھیلایا ہوا "صلیبی دین" اور نظریہ ولدیت کے ساتھ کفارہ کا مسئلہ اندر ہی اندر یورپ کے باشندوں میں پھیلتا رہا۔ بت پرست رومی حکومت نے اس جدید دینی تحریک کی مخالفت میں اپنا آخری زور صرف کر دیا مگر جتنا اس کو دبایا جاتا تھا اسی قوت کے ساتھ یہ تحریک آگے بڑھتی چلی جاتی تھی۔ تا آنکہ تین سو سال بعد کہتے ہیں کہ بت پرست رومی بادشاہ قسطنطین نے بالآخر یہی فیصلہ کیا کہ خود وہ اس دین کو قبول کر لے گویا یوں رومی حکومت بجائے دشمن کے صلیبی دین کی دوست اور پشت پناہ بن گئی۔ حکومت کی اس پشت پناہی کے زیر اثر روم کے کلیسا کا اقتدار غیر معمولی طور پر بڑھنے لگا۔ یورپ کی مستند تاریخ جس کے مصنف گرانٹ صاحب ہیں اپنی کتاب میں انہوں نے چند وثیقوں کا تذکرہ کیا ہے جن کے متعلق کلیسائے روم کا دعویٰ تھا کہ وقتاً فوقتاً رومی حکومت کی طرف سے اسے عطا ہوئے۔ جن میں ایک مشہور ترین وثیقہ وہی ہے جس کا نام "عطیہ قسطنطین" تھا۔ گرانٹ صاحب نے اس کا ترجمہ یوں درج کیا ہے۔

> ''شاہنشاہ قسطنطین ثانی (قسطنطین اوغسطس) رحم دل آور نیک متقی بادشاہ اقوام الماتی و سرماتی و جرمنی و برطانی و ہونی پارسا، خوش نصیب فاتح و غازی دائمی شان سرمدی جذام میں مبتلا تھا اور بت پرست پجاریوں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ معصوم بچوں کے خون میں نہائے بغیر اسے صحت نہیں ہو سکتی مگر سینٹ پال اور سینٹ پیٹر کی دعاؤں سے اسے صحت حاصل ہوئی اور صحت یابی کے شکریے میں اس نے حکم دیا کہ کلیسائے روم کا "قسیس اعلیٰ" تمام دنیا کے قسیسوں کا سردار ہوگا اور پوپ سلوسٹر تب سے محلات روما اور خود شہر روم اور اطالیہ کے تمام اضلاع اور صوبوں اور ممالک مغرب (یورپ) پر قابض رہے گا۔''

گرانٹ صاحب نے لکھا ہے کہ اس عطیہ قسطنطین کے آخر میں یہ الفاظ بھی تھے۔

> ''ان احکام میں ہرگز کسی قسم کی ترمیم یا تنسیخ نہ کیا جائے''

(دیکھو گرانٹ کی تاریخ یورپ ص ۲۰۲ ترجمہ اردو دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ)

مطلب یہ تھا کہ روم جہاں دعویٰ کیا جاتا تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے براہ راست حواری

یا حواری پطرس جن کا اصلی نام شمعون تھا ان کا درگاہ ہے اور ان کے ساتھ پولس یعنی سینٹ پال کا مدفن بھی وہیں بتایا جاتا تھا گویا دونوں بزرگوں کے مجاوروں کی طرف سے بادشاہ کو خوش خبری صحت کی سنائی گئی۔ صحت کے بعد یہ مصر شاہی دربار سے ملا۔ گرانٹ صاحب نے لکھا ہے کہ:

"پندرھویں صدی عیسوی تک جس میں یورپ میں پھر علوم کا دور دورہ ہوا کسی میں ہمت نہ تھی کہ اس تحریر کو جعلی قرار دے یا اس کی صحت میں شک و شبہ کرے"

(ص ۲۵۱ کتاب مذکور)

بعد کو جو کچھ ہوا اس کا قصہ تو آگے آرہا ہے اتنی بات تو عرض بھی کر چکا ہوں کہ مسیح کے حواری پطرس کی درگاہوں کو اس زمانہ میں فرضی قرار دیا گیا ہے لیکن بقول گرانٹ صاحب ۸۹۰ء جس میں مذکورہ بالا وثیقہ کا اعلان کلیسا کی طرف سے کیا گیا تھا اس وقت سے ہزار بارہ سو سال تک ان کے متعلق شک کا خیال بھی ارتداد و کفر کے ہم معنی تھا۔

اور ایک یہی کیا اسی قسم کے سینکڑوں ذرائع مسلسل اختیار کیے گئے تا آنکہ بقول گرانٹ صاحب گیارھویں صدی عیسوی کے مشہور پوپ گریگری ہفتم کے زمانہ میں کلیسا کی طرف سے یورپ کے حکمرانوں اور سلاطین و امرا اور عام باشندوں کو خطاب کرکے یہ اعلان شائع کردیا گیا کہ:

"پاپائے روم کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں۔ اس کے اقوال پر حرف گیری کرنے والا کوئی نہیں کلیسائے روم کو نہ کبھی دھوکا ہوا ہے اور نہ ہوگا"۔

اسی ذیل میں یہ بھی تھا کہ:

پوپ کو شہنشاہوں کے معزول کرنے کا اختیار ہے۔ انسانی نخوت نے بادشاہوں کی قوت پیدا کی اور خدا کے رحم نے بشپوں کی قوت پیدا کی۔

آخر میں تھا کہ:

"پوپ شہنشاہوں کا آقا ہے"۔ (کتاب مذکور ص ۲۴۸)

اور یہ صرف دعویٰ ہی نہ تھا جنہوں نے یورپ کی قرون متوسطہ کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہی واقعہ بھی تھا۔ اسی قسم کی تحریریں جیسا کہ گرانٹ ہی نے لکھا ہے عموماً پوپوں کی

طرف سے بادشاہوں کو دھمکانے کے لئے شائع ہوتی رہتی تھیں کہ:

"خدا نے ہمیں (یعنی پوپ اور پوپ کے چیلے چانٹوں کو) بادشاہوں اور شہنشاہوں کا سرتاج بنایا ہے تاکہ ہم اس کے نام سے جسے چاہیں اکھاڑ پھینکیں تباہ کر دیں اور اگر چاہیں تو تعمیر نو کریں اور نئی عمارت بنائیں۔"

یہ دعویٰ بھی کیا جاتا تھا کہ

"اگر دنیاوی حکومت سے غلطی ہو جائے تو روحانی حکومت اس کی اصلاح کر سکتی ہے اور اگر روحانی حکومت سے کوئی غلطی سرزد ہو تو اس کا انصاف کرنے والا خدا ہے"

اور یوں یورپ کی ساری دنیاوی حکومتوں کے حکمران' روحانی حکمران یعنی پوپ اور پوپ کے نمائندوں کے آہنی شکنجوں میں اس طرح دبے ہوئے تھے کہ بلا چون و چرا پوپ کے احکام کی تعمیل کرتے چلے جائیں اس کے سوا ان کے لئے کوئی چارہ باقی نہ رہا تھا۔

عام رعایا بیچاری ان ہی حکمرانوں کے قبضے میں تھی' اس لئے نتیجتاً یورپ کے عام باشندے کلیسا کے احکام سے سرتابی کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔

ماسوا اس کے "اعتراف گناہ" کا ایک طریقہ بھی کلیسا کی طرف سے عوام میں جاری کیا گیا تھا' پوپ کے نمائندے ملک کے طول و عرض میں میل دو میل کے فاصلوں سے اپنے تھانے "چرچ" بنا کے بیٹھے رہتے تھے' ان کا کام یہی تھا کہ توبہ کرنے والوں کے گناہوں کی فہرست کی خلوت میں سماعت کریں اور جو معاوضہ طے ہو جاتا تھا اس کو لے لے کر مغفرت اور بخشش کا لائسنس توبہ کرنے والوں کو عطا کیا جاتا تھا۔ اس مغفرت نامہ کو تاریخوں میں آج بھی لوگ نقل کرتے ہیں جس سے توبہ کرنے والوں کو کلیسا کے نمائندے سرفراز کرتے تھے۔ ابتداء اس مغفرت نامہ کی ان الفاظ سے ہوتی تھی:

"ہمارا رب مسیح تجھ پر رحم کرے اور جن مقدس تکلیفوں کو اٹھا کر مسیح کو جو حقوق حاصل ہوئے ہیں ان کے معاوضہ میں تیرے گناہ معاف ہوں۔"

مغفرت نامہ کی پیشانی کی اس عبارت کے بعد آگے یہ ہوتا تھا:

"ہمیں معلوم ہوا کہ مسیح کے رسولوں پطرس و پولس اور جلیل القدر پوپ کی حکومت نے اس

کلیسا کے مذہبی خدام کے بچوں کی ہے" (اظہار الحق ج ۲ عربی)

الغرض کلیسا کی "رہبانیت" باہر سے کچھ بھی نظر آتی ہو لیکن بتدریج اندر ہی اندر یہی "رہبانیت" فسق کی "آلائش" کے گرداب میں ڈھلتی گئی۔ قرآن کا یہ ایک ایسا دعوٰی ہے جس کی تائید سے کلیسا کی تاریخیں لبریز ہیں۔ ان اندرونی گندگیوں اور غلاظتوں کے ساتھ ساتھ اسی کلیسا کی قوت کی بدولت باہر بھی "پوپ" کا لاہوتی اقتدار بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ کلیسا کی طرف سے فرنسیس زابادلا جو پوپ کی مجلس خاص (کونسل) کارڈینل تھا ① اس نے یہ اعلان عام کر دیا تھا کہ

"پوپ کو حق حاصل ہے کہ جو کچھ اس کے جی میں آئے کرے تا آنکہ خدا نے جن چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے پوپ چاہے تو ان کو حلال قرار دے سکتا ہے"

آخر کے الفاظ (العیاذ باللہ) اس "اعلان عام" کے یہ تھے:

"پوپ (اقتدار) خدا سے بھی بڑھا ہوا ہے" (اظہار الحق عربی ج ۱۴۲)

اور آئے دن پوپ اپنے اس فرعونی اقتدار سے عموماً کام لیا کرتا تھا

پروفیسر میکائل (میخائیل) کی عربی کتاب جو بیروت میں ۱۸۵۲ء چھپی ہے اس میں آپ کو طویل فہرست ان چیزوں کی ملے گی جن میں پوپ نے اپنے اقتدار سے رد و بدل کیا تھا۔ میخائیل نے لکھا ہے:

"روپیہ لے کر حرام کو حلال، حلال کو حرام کر دینا یہ پوپ کا عام دستور تھا"

مغفرت نامہ کی تجارت، یا حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرانے کا مقدس معاوضہ اور عام نذر و نیاز اور اوقاف ② وغیرہ وغیرہ کی آمدنی کے بے شمار ذرائع کے سوا، یہ شرمناک واقعہ ہے

① کلیسائی نظام میں مختلف عہدوں کے مختلف نام تھے، اسقف جو یونانی لفظ کا معرب ہے یہ سب سے بڑا عہدہ تھا انگریزی میں اسی کو "بشپ" کہتے ہیں۔ اسقفوں کے بعد قسیس، قسیس کے بعد شماس اور پریلیٹ کا درجہ تھا۔ پوپ کی کونسل الگ تھی جس کے ارکان کی تعداد ستر تھی، اس کونسل کے رکن "کارڈینل" کہتے تھے۔ ۱۲

② جو چیز کے ساتھ کسی بزرگ (ولی) یا شہیدوں کی قبروں کا جال ملک کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا وہ بھی ایک بات تھی کہ ہر ایک مردہ سے نسبت رکھنے والوں کے عقیدت و نیاز کی مرکز تھی (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

فاش ہو رہے ہیں۔ افراد و اشخاص کی گرفت کے لیے ایک ایسا جال تھا جس میں لوگ اپنے آپ کو جکڑا ہوا پاتے تھے۔

پھر رسم و رواج و عادات اسی قسم کے عام قوانین کا اقتضاء بھی ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ نئے بہ عمومیت میں اسی نوعیت کے اثرات بتدریج پیدا ہو جاتے ہیں یونہی کلیسا کو اپنی من مانی کاروائیوں کے جاری رکھنے کا موقع قرنہا قرن تک ملتا رہا۔

لیکن آخر ہر چیز کی ایک حد ہے بلکہ یوں سمجھئے کہ عمر ہوتی ہے قدرت جو تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے نشیب و فراز سے گزارتے ہوئے نسل انسانی کو آگے کی طرف بڑھاتی چلی آ رہی ہے وہی قدرت جبر عمل نے اور ردعمل کے اسباب و وجوہ کو پیدا کرتی رہتی ہے۔

کلیسا کے بڑھتے ہوئے مذکورہ بالا غیر معمولی اقتدار کے مقابلہ میں ردعمل کا اسباب وعلل کے کن کن قالبوں میں قدرت کی طرف سے نشوونما ہونے لگا اس کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں ہے تاہم اتنی بات تو کھلی ہوئی ہے کہ مظالم اور بیہودگیوں کا جو سلسلہ ڈاکوؤں اور چوروں رہزنوں اور غارت گروں کی طرف سے نہیں بلکہ دین اور مذہب کے مدعیوں کی طرف سے شروع ہوا تھا خود اس کی تعبیر ہی میں خرابی کی صورت مضمر تھی۔ آدمی چوروں اور ڈاکوؤں سے بھی نفرت کرتا ہے اور ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے لیکن شیطان شیطان کے لباس میں نہیں بلکہ فرشتوں کے جبوں میں جب سامنے آئے اور معلوم ہو جائے کہ ان ملکوتی جبوں کے نیچے ابلیسی روحیں پوشیدہ ہیں تو یہ واقعہ ہے کہ جرم و طغیان کے خلاف انسانی فطرت کی برہمی کا پارہ غیر معمولی طور پر زیادہ بہت زیادہ چڑھ جاتا ہے۔ جیسے جیسے کلیسا کے جبہ میں شیطان اپنے پروں کو آگے بڑھا رہا تھا اندر ہی اندر عمومیت کی فطرت میں آتشیں لاوے تیار ہوتے چلے جاتے تھے مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا اندر ہی تیار ہونے والے ان لاووں کو باہر نکلنے کے لئے کوئی راستہ نہیں ملتا تھا سوراخ پیدا ہوتے تھے لیکن ان کو فوراً جبر و استبداد کی قوتوں سے بند کر دیا جاتا تھا۔

اسی عرصہ میں "کروسیڈ وار" یعنی مولد مسیح علیہ السلام کو مسلمانوں کے ہاتھ سے چھڑانے کے لئے صلیبی لڑائیوں کا جو سلسلہ کلیسا کی طرف سے چھیڑا گیا اور اس راہ میں کامیابیوں سے زیادہ ناکامیوں ہی سے پرستاران صلیب کو دوچار ہونا پڑا اور کلیسا کے نمائندوں کی طرف سے جن

ایسی مذہبی حرکتیں بھی سرزد ہوئیں جن سے عوام کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا ❶ کہتے ہیں کہ ان ہی صلیبی لڑائیوں میں ایک نئے دین اسلام کے نظام کا تجربہ کرنے کا بلاواسطہ موقع یورپ کے عیسائی باشندوں کو ملا۔ اس کے ساتھ یورپ کے بعض قوی پنجہ قوی العزم والا ارادہ سلاطین سے کلیسا اور یورپ میں مزاحمت بھی شروع ہوئی اور یہ مزاحمت آگے بڑھتے ہوئے اپنی آخری شکل تک پہنچ گئی جس نے کلیسائی کے استحکام کو ایک گونہ متاثر کیا۔ ❷

الغرض یہ اور اسی قسم کے گوناگوں پیچیدہ اسباب پے در پے یکے بعد دیگرے مسلسل پیدا ہوتے چلے گئے کہ ہر اندر کلیسا کے خلاف جو آگ عوام کے سینوں میں سلگ رہی تھی اور جو آتشیں لاوے پیدا ہو رہے تھے ان کو ابھرنے کا موقع مل گیا۔

پروٹسٹنٹ یعنی احتجاج کی طرف منسوب کر کے مسیحی دین کی تاریخ میں پروٹسٹنٹ فرقہ کا جو ذکر آتا ہے، در اصل یہی اندرونی آگ اور لاوے کے ان دہانوں کی تعبیر ہے جن کی راہ سے کلیسا

❶ مطلب یہ ہے کہ پوپ اور اس کے جانشین مسیح کے نام پر لوٹ مار، قتل و غارت گری وغیرہ ہی نہیں بلکہ بچوں کی تعداد میں عیسائیوں کو لڑواتے رہے تھے۔ اسی سلسلہ میں اسٹیفن نامی کسی چرواہے کے ایک لڑکے نے بعض پادریوں کے مخفی اشاروں سے دعویٰ کیا کہ خدا کا پیغام اس کو ملا ہے۔ خواب میں روٹی دی اور حکم دیا گیا کہ کمسن لڑکوں کی فوج تیار کر کے مقدس مسیح کی قبر کی واگذاشت کی کوشش کرے۔ یہ ۱۲۱۲ء کا واقعہ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یورپ کے علاقے کے خاندانوں سے لڑکے اور لڑکوں کے ساتھ لڑکیاں بھی نکل گئیں جن کو مارسیلز پہنچایا گیا اور جہازوں پر سوار کر کے لڑکوں کی یہ فوج یورپ سے روانہ ہوئی۔ یاد دلایا گیا تھا کہ راستے میں جو سمندر بھی ملے گا خود بخود خشک ہو جائے گا۔ بہرحال مارسیلز میں عیسائی سوداگروں نے لڑکوں کی اس فوج کو جہازوں پر لادا اور بے ضمیر تاجروں نے ان غریب بچوں کو مصر میں لے جا کر بیچ دیا۔ دو جہاز تو راستہ میں طوفان میں غرق ہوئے۔ لکھا ہے کہ لڑکوں کے ماں باپ روتے رہے مگر ان کی کوئی کچھ بھی سنتا تھا۔ لڑکوں کی یہ فوج ایک سے زیادہ مرتبہ تیار کی گئی جو راستہ ہی میں تباہ ہوتی رہی۔

❷ مثلاً جرمنی کے شاہنشاہ فریڈرک یا انگلستان کے بادشاہ ہنری چہارم وغیرہ اسی قسم کے مختلف سلاطین و ملوک کے من واقعات کا تذکرہ تاریخوں میں پایا جاتا ہے۔ ہنری چہارم کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ جب ہلڈی برانڈ نامی پوپ نے ہنری کو ملعون ٹھہرا کر کلیسا بدر کرنے کا حکم دیا تو ہنری نے بھی پوپ صاحب کو لکھا کہ تو بظاہر پوپ ہے لیکن درحقیقت ایک بدکردار راہب ہے۔ (دیکھو مراۃ کی تاریخ یورپ ص ۲۰۰)

اسی طرح فرانس کے بادشاہ فلپ خوب رو نے بانفس اکتم ہائی پوپ سے اس قربان کو جلوا اکہ "ہم جب جسے چاہتے ہیں نکال دیتے ہیں اور جس بادشاہ کو چاہتے ہیں باقی رکھتے ہیں" (انقلاب عظیم حکومت پوپ ص ۱۲۱)

کی مخالفت تک باہر نکلنے لگی۔

ایک ہی ملک میں نہیں بلکہ یورپ کے مختلف علاقوں میں آگے پیچھے مختلف شخصیتیں جرأت سے کام لیکر کلیسا اور پوپ کے خلاف علانیہ اٹھ کھڑی ہوئیں جن میں جرمنی کے "مارٹن لوتھر" سوئٹزرلینڈ کے "زونگلی" "فرانس کے" کالون نامی" وغیرہ افراد نے غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ جن کے تفصیلی حالات کا مطالعہ یورپ اور کلیسا کی تاریخوں میں کرنا چاہئے۔

حاصل ہر ایک کے احتجاج اور پروٹسٹ کا یہی تھا کہ مسیحی دین کی ٹھیکیداری یعنی انجیل (توراۃ وانجیل وغیرہ) کی تشریح کا حق جو کلیسا نے اپنے ساتھ مخصوص کر رکھا ہے صحیح نہیں ہے اور نہ نجات کے لئے کلیسائے روم اس کے پوپ، پوپ کے نمائندوں کو واسطہ بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ ہزار ہا ہزار صفحات کا خلاصہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ابتداءً احتجاج اور پروٹسٹ کے اس قصے کا تعلق صرف کلیسا، پوپ، پوپ کے نمائندوں اور ان لوگوں کی پیش کردہ مسیحی دین کی شکل سے تھا۔ شروع میں یہی قسمت تھا مگر کلیسا کے لئے یہ مختصر احتجاج بھی ظاہر ہے کہ کسی حیثیت سے بھی قابل برداشت کیسے ہو سکتا تھا۔ چاہا گیا کہ "گرہ" کے ساتھ سختی کے فعل کو پہلے ہی شروع کر دیا جائے ورنہ "دانتوں" (ہاتھی) سے بھی اس سیلاب کا روکنا ممکن نہ ہوگا جس کی روانی ابھی صرف میل یعنی سلائی سے روکی جا سکتی ہے۔

کلیسا اور عوام میں کشمکش کی ابتدا ہوگئی پوپ کی جماعتوں میں عدالت ہائے تحقیق مذہبی (INQUISTITION) اور "لشارو زنت" یا "ایوان آتشیں" وغیرہ کی اصطلاحیں جو ملتی ہیں درحقیقت ان ہی الفاظ میں اس منحوس کشمکش کی خونیں اور آتشیں داستانیں چھپی ہوئی ہیں۔

کلیسا کے خلاف صرف احتجاج ہی نہیں بلکہ اشارۃً و کنایۃً تحریراً و تقریراً کسی قسم کا کوئی لفظ زبان سے نکالنا جرم ٹھہرایا گیا۔ کلیسا نے فتویٰ صادر کیا اور سارے سلاطین و امراء جن کی سلطنت و امارات کی بنیاد صرف کلیسا کے رحم و کرم پر منحصر تھی انہوں نے اس فتویٰ کی تعمیل کے لئے نیاموں سے تلواریں باہر نکال لیں، ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مجرموں کو زندہ در آتش کرنے کے لئے مقدس الاؤ جوڑ دیئے گئے۔

پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ سال دو سال کا قصہ ہو تو بیان کیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ کشمکش کا یہ

کیفیت رومن کیتھولک یعنی حامیان کلیسا اور پروٹسٹنٹ' مخالفات کلیسا ان دونوں فرقوں کے درمیان پانچ چھ صدیوں تک انتہائی قساوت قلبی' سنگدلی کے ساتھ جاری رہی۔ قدرتاً پروٹسٹنٹ خیال کے حامیوں کی تعداد شروع میں کم تھی ہر علاقہ اور خطہ میں کیتھولک اکثریت غریب پروٹسٹنوں کی اقلیت کے ساتھ جو جی میں آیا کرتی رہی۔ عدالت ہائے مذہبی یا مجلس تحقیقات ارتداد میں مقدمہ پیش ہوتا جلتی کی رسمی کارروائی کے بعد قتل یا زندہ جلا دینے کا فیصلہ صادر کر دیا جاتا اور کیتھولک فرقہ کے عیسائی بڑی دلچسپیوں کے ساتھ خون اور آگ کی ان ہولیوں کا تماشا دیکھا کرتے تھے۔

لکھا ہے کہ الحاد یا ارتداد کے فتویٰ کے بعد دیکھا جاتا تھا کہ مجرم کو پلنگ کے ساتھ باندھ دیا گیا ہے' غریب چت لٹا دیا جاتا' چھت میں بڑا ہتھیار لٹکا دیا جاتا جو آہستہ آہستہ کئی دن میں لٹکتے ہوئے مجرم کے سینے پر ضرب لگاتا اور یوں اس غریب کی جان نکال لی جاتی یا گھٹ گھٹ کر نکل جاتی۔

اس سلسلے میں کن کن شہروں میں قتل عام کے واقعات کتنی دفعہ پیش آئے اور قتل عام کے ان واقعات میں کتنی جانیں کام آئیں ان کی فہرست یورپ کی تفصیلی تاریخوں میں مل سکتی ہے۔

فرانس کا مشہور ہنگامہ "بارتھیلمی" کے ہنگامے کے نام سے جو مشہور ہے' کہتے ہیں کہ ۹ دن تک پروٹسٹنٹ فرقہ کے مردوں اور عورتوں کے قتل عام کا حکم نافذ رہا' لکھا ہے کہ حاملہ عورتوں کے پیٹوں کو چاک کر کے کلیسائی کیتھولک بھیڑیے زندہ بچوں کو نکالتے اور کتوں کے آگے ڈال کر پھاڑے اور کھائے جانے کا تماشا دیکھتے۔ پیرس کے دریائے سین کا پانی مقتولوں کے خون سے سرخ ہو گیا تھا۔ ❶

خلاصہ یہ ہے کہ کوشش کی گئی اس سلسلہ میں تخمینہ کیا گیا ہے کہ جو مارے گئے زندہ جلا دیئے گئے یا دوسرے طریقوں سے ان کو قتل یا ذبح کیا گیا' تخمیناً دس لاکھ افراد تک ان کی تعداد پہنچتی ہے۔

---

❶ انگریزی زبان جو نہیں جانتے وہ علامہ فرید وجدی کی عربی کتاب "کنز العلوم واللغة" میں ان واقعات کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ۱۲

یہ تو ''انصار'' کے لفظ کی لغوی شرح ہوئی آگے ھم کی ضمیر سو ظاہر ہے کہ اس کا مرجع اور اس سے مراد وہی لوگ ہیں جو ''عقیدہ ولدیت'' کے قائل تھے۔

اس کے بعد اب اجمالی تفصیلات کو اپنے سامنے لائیے جن سے گزرتے ہوئے ''عقیدہ ولدیت'' موجودہ دور تک پہنچا ہے۔

جن لوگوں نے شروع شروع میں خالق عالم کے متعلق ''ولدیت'' کے اس عقیدہ کو تراشا دنیا سے وہ چلے گئے ان کے بعد کلیسا اور کلیسا سے پوپ کی ذریت پادری پیدا ہوئے۔ پھر اس نظام کے تحت جن ناگفتہ بہ حالات سے یورپ کے عوام کو گزرنا پڑا جس سے احتجاجی ذہنیت پیدا ہوئی اور وہی احتجاجیت آگے بڑھتے ہوئے یہی نہیں کہ صرف پوپ اور کلیسا کے اقتدار کی منکر ہوگئی بلکہ جوں جوں ایک فریق کا تشدد بڑھتا جاتا تھا فریق مقابل کی سختیاں اور سرزوریاں بھی اسی نسبت سے ترقی پذیر ہوتی رہیں تا آنکہ مسیح کے حواری لیڈروں کے وجود کا بھی انکار کیا گیا۔ آخر میں مسیح کا وجود بھی مشکوک ٹھہرایا گیا اور بالآخر اس کی انتہاء العیاذ باللہ اس شک پر ہوئی جس کے بعد انسان کے لئے اپنی انسانیت کو باقی رکھنے کے لئے کوئی ٹیک ہی باقی نہیں رہتی یعنی خود مسیح کے باپ کا دوسرے لفظوں میں کہئے کہ حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کے وجود میں شک اندازیوں کی راہیں یورپ میں درست ہونے لگیں اور عمومیت کی زبان پر خدا بھی باقی رہا بلکہ خدا کا مسیح بھی، مسیح کی انجیل بھی لیکن اس طویل وعریض آبادی کے اکابر کے دل میں سچ پوچھئے تو کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔

دل کی بات دل ہی تک محدود کب رہتی آخر مشرقی یورپ میں شیوعی یا بالشویکی نظام نے سر اٹھایا، جس میں زبانوں سے بھی وہی کہلوایا جاتا ہے اور کہنے پر مجبور کیا جاتا ہے، جسے مغربی یورپ کے باشندے اب تک اپنے دلوں میں چھپائے بیٹھے تھے، اور اس کے بعد قدرتاً انسانی نسلوں اور دوسرے حیوانی سلسلوں میں کسی فرق کا باقی رکھنا ناممکن ہو گیا۔ جیسے ایک مکھی پیدا ہوتی ہے، جان لے کر پیدا ہوتی ہے، احساس لے کر پیدا ہوتی ہے، اور اپنے جیسی ہی چند مکھیوں کو پیدا کر کے ناپید ہو جاتی ہے۔ آدمی کی قدر وقیمت کی کوئی وجہ باقی نہ رہی کہ اس سے زیادہ کسی امتیاز خاص کی مستحق قرار دی جائے۔

میں اس آدمی کے لئے نکل آئی جو بہشت بریں کا باشندہ و متوطن تھا۔

کچھ بھی ہو "ما علی الارض" یعنی زمین پر جو کچھ ہے اس کے جھمیلے میں شریک ہو کر آدمی کا وجود بھی زمین کی حسن افزائیوں اور جمال آرائیوں میں کافی حصہ لے رہا ہے مگر اپنے اس طریقہ سے جیسا کہ قرآن توجہ دلا رہا ہے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کسی چیز کے حسن و جمال میں وہ اضافہ کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ خود انسان نہیں بلکہ خاک اور دھول کا یہی مجموعہ زمین سے ہی حاصل ہے۔

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا کے الفاظ کا۔

اسی لئے آگے فرمایا گیا ہے کہ جمالیات و کمالات کے جو لامحدود ذخیرے زمین میں نہیں بلکہ خود انسانی فطرت کے اندر دبے ہوئے ہیں۔ ان کو بروئے کار لانے کی تدبیر ہے کہ لا انسان لامحدود کمالات والے خالق کائنات سے ربط پیدا کرے اور اعمال کے حسن و قبح بھلائی برائی کا واحد معیار اسی کی مرضی مبارک کو ٹھہرا لے اور یہی مطلب ہے۔

"لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا"

کا یعنی "تاکہ جانچیں (یا آزمائش کریں) ہم اس بات کو کہ ان میں (انسانوں میں) عمل سب سے اچھا کون ہے"۔

بلکہ یوں تو مجموعی طور پر آیت کے ان دو ٹکڑوں سے ابھرتی ہوا اشارہ مل سکتا ہے کہ لا انسان کی طرف منسوب ہو کر اور اس کے لئے وقتی مستقر یا قیام گاہ بننے کی نسبت نے جب زمین کو حسن و جمال سے مالا مال کر دیا اور اس کی بہت سی پوشیدہ صلاحیتیں انسانی وجود کے ساتھ مربوط ہو کر منصۂ شہود و ظہور پر جلوہ نما ہو رہی ہیں تو اسی سے اندازہ کرنا چاہیے کہ خالق کائنات کے ساتھ وابستگی اور ربط انسانی وجود کے کن مخفی ذخیروں کو ابھار سکتا ہے اسی سورۃ کے آخری عشرہ کے خاتمہ میں یہ بیان کرتے ہوئے کہ جنتی زندگی سے بازگشت کی خواہش دلوں میں پیدا نہ ہوگی یعنی کہ ایک ہی قسم کی زندگی کے تسلسل سے انسانی فطرت کا قاعدہ ہے کہ اکتا جاتی ہے بورڈم کے کھانے کی بدمائی کا راز اس کی ایک رنگی اور تسلسل ہی میں پوشیدہ ہے اسی سوال کو پیش نظر رکھتے ہوئے آگے حق تعالیٰ کے کلمات کی لامحدودیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس میں اشارہ اسی بات کا

دیا جہاں یہ غریب آج کھڑے ہوئے ہیں یہ صحیح ہے کہ ترقی ہونے کے بعد فلسفیانہ جھپٹ نہ ہاتھوں
اور مسائل سائنس کے غلط استعمال سے بھی بعد کو جو حاصل کی گئی عمر تحقیقی اسباب ہے دینی
اس زندگی کے ہوتی ہیں جن کی طرف قرآن نے ثارحم کے دو لفظوں سے اشارہ کیا ہے۔

بہرحال واقعہ ہو چکا ہے اور سب کے سامنے ہے اپنی اس "خدا بیزاری" کی خصوصیت کو
موما اب وہ چھپاتے بھی نہیں بلکہ اس تاریخی قلابازی کی آخری شکل جس کا نام اشتراکیت یا
بالشوازم وغیرہ ہے جیسا کہ کہنے والے کہتے ہیں ان کے پرچم کا سب سے نمایاں امتیازی طغرائی
یہی ہے کہ "ہم خدا سے بیزار ہیں"

انصاف کی بات یہی ہے کہ آج اشتراکیوں کی طرف خدا بیزاری کے اس سلسلے میں
جو کچھ بھی منسوب کیا جا رہا ہے اور بظاہر اسے نئی بات ٹھہرانے کی جتنی کوششیں بھی ہو رہی ہوں
لیکن جہاں تک میرا خیال ہے ان کا قصور اس سے زیادہ نہیں ہے کہ ان کے بدنام کرنے والوں
کے دلوں میں جو کچھ تھا جرأت سے کام لے کر اسی کو بدنام کئے جانے والے اپنی زبانوں پر بھی
لے آئے ہیں گویا جو "اندر" تھا وہی "باہر" نکل آیا ہے۔

یہی دل والے ہوں یا زبان والے "اندر والے" ہوں یا باہر والے یقیناً ان دونوں میں سے
کسی کی سوسائٹی میں اس کی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے کہ انسانی وجود کے اس پہلو کو سوچیں بھی
جس میں زمین کے حسن و جمال کے فروغ و اضافہ کا نہیں بلکہ براہ راست خود اسی انسانی وجود کے
معنوی محاسن اور باطنی خوبیوں کے ظہور کا راز پوشیدہ ہے۔ آخر خدا بیزار ذہنیت میں خدا طلبی اور
خدا کا خیال خود ہی بتایئے کہ کس راہ سے آئے۔ خدا کی مرضی کو انسانی اعمال و افعال کے حسن و قبح
کا معیار بنانے کی صورت ہی کیا باقی رہی ہے جب سے خدا ہی کا اذن دلوں سے نکل چکا ہے تو
خدا کی مرضی کی تلاش کا جذبہ آخر کس راہ سے ابھرے یا ابھارا جائے۔

سچ تو یہ ہے کہ تھانے میں رپٹ لکھوانے کا اتفاق بھی ہو کر خدا کا نام لینے والے مہذب و
شائستہ مجالس کی شرکت کے استحقاق سے آج محروم ہو جاتا ہے کیا اس کی واقعیت کا بھی کوئی انکار
کر سکتا ہے؟ پھر نتیجہ کیا ہوا؟ وہ آپ کے اور ہمارے سامنے ہے۔ انسانی وجود کا خدائی پہلو مفلوج
و مردہ ہو کر رہ گیا۔ لے دے کر جو چیز باقی رہ گئی وہ اب صرف یہی ہے کہ اسی مٹی اور کیچڑ کے

تو اس کے ساتھ انسانیت لپٹ پڑی ہے اس کے سوا اور کوئی دوسرا کام آدمی کے لئے نہیں رہ گیا ہے کہ زمین کی گری پڑی چیزوں کو اٹھا اٹھا کر ان کے حسن میں حسن کا، قیمت میں قیمت کا اضافہ کرتا چلا جائے۔ لامحدود توانائیوں کا جو گراں قدر بیش قیمت ذخیرہ اس کے استعمال کا اول بھی یہی ہے اور آخر بھی یہی ہے انجام یہ ہے کہ زمینی رعنائیوں کے بڑھانے میں خواہ ڈسن تن بن کر کوئی کیوں نہ مرتا ہو لیکن انسانی محاسن و کمال کے لحاظ سے ایک نومولود بچہ کی جو حالت ہوتی ہے وہی حال اس بڈھے کا اس وقت بھی ہوتا ہے جب زندگی کے تمام مرحلوں کو طے کر کے زمین سے وہ رخصت ہوتا ہے گویا اس لحاظ سے اسی حال میں وہ مرتا ہے جس حال میں پیدا ہوا تھا۔ خواہ زمینی حسن زیبائش اور سج دھج کے اضافہ میں کسی قسم کے غیر معمولی کارنامے اس سے کیوں نہ ظاہر ہوئے ہوں۔

عقیدہ ولدیت کے آثار نے دنیا میں جس حشر کو آج برپا کر رکھا ہے وہ یہی ہے۔ مٹی بڑھ رہی ہے بڑھتی چلی جا رہی ہے چمک رہی ہے چمکتی چلی جا رہی ہے اس کے حسن و جمال پر اضافہ پر اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے مگر انسان گر رہا ہے گرتا چلا جاتا ہے بجھ رہا ہے بجھتا چلا جا رہا ہے اور میں نے شاید غلط کہا کہ جس حال میں پیدا ہوا تھا اسی حال میں مرتا ہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ پیدائش کے وقت کم از کم معصوم حیوان یا غیر مضر جانور تو وہ رہتا ہے لیکن اس "خدا بیزار" تمدن کے زیر اثر زندگی بسر کرنے والوں میں خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے مرنے والے مرنے کے وقت شیطان کی بھی ناک کاٹ کر مرتے ہیں آج ان ہی شیطانی انسانوں نے اسی "جنت نما" زمین کو اذیت رسانی میں قریب قریب جہنم کے حدود تک پہنچا دیا ہے۔

لیکن یہ تو وہ ہے جو ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے مگر آئندہ یہی صورت حال کس مہیب ڈراؤنے انجام کو آدمی کے سامنے لانے والی ہے جہاں تک میرا خیال ہے مذکورہ بالا دو آیتوں میں سے آخری آیت میں شاید اسی کا جواب تلاش کرنے والوں کو مل سکتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ خالق کائنات سے قطعی بے تعلق ہو کر اپنی خدا بیزار زندگی کے ساتھ جو راضی اور مطمئن ہو چکے ہیں۔ ان کے اس اطمینان کا نتیجہ یہ ہوا کہ توانائیوں کا وہ سارا سرمایہ صلاحیتوں کا سارا ذخیرہ جو انسانی وجود میں بھرا گیا تھا خالق تعالیٰ سے ٹوٹ کر کلیتہً زمین

تی کے بناؤ سنگھار کی طرف اس کا رخ مڑ گیا۔ ایک طرف اس کھوکھلے پن کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ زمین بناؤ سنگھار آرائش و زیبائش کے نت نئے سامانوں سے دنیا پٹ گئی اس عہد میں بحری اور بحری ترقی چلی جا رہی ہے انسانیت کی تاریخ میں یا کم از کم تاریخ معلوم میں اس کی قطعاً کوئی نظیر نہیں ہے ہر دن نئے انکشافات جدید مصنوعات، ایجادات کو اپنے جلو میں لا رہا ہے ابھی ایک تماشا ختم بھی نہیں ہو پاتا کہ دوسرا انقلاب بصورت نظر آنے لگتا ہے۔

اس سلسلے میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے ہم بھی دیکھ رہے ہیں اور آپ بھی دیکھ رہے ہیں لیکن زمین کی زیب و زینت کے قصوں میں ڈوب کر خود اپنے محاسن و جمال کو فراموش قطعی فراموش کر دینے والا انسان ایجادات و اختراعات کی ان راہوں سے زیب و زینت کے ساز و سامان کے ساتھ ساتھ اسی زمین کی ویرانی و بربادی کے سامانوں کو بھی غیب سے کھینچ کھینچ کر دائرہ شہود و وجود میں جو لا رہا ہے دنیا کی آنکھوں سے کیا اوجھل ہیں؟ دیکھئے ہائیڈروجن بم کے جہنمی ذرات ہیں اور یہ ہائیڈروجن کے ان دیکھے کرشمے ہیں۔ یہاں آ کر یہ دانائی ایجادات واختراعات کے سوا ہیں جن کی دنیا اب تک تجربہ کر چکی ہے۔ دیکھئے اس وار کو پڑھئے قرآن میں۔

وَإِنَّا لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا جُرُزًا۔

"اور ہم بنا دینے والے ہیں (ان ساری چیزوں) کو جو زمین پر ہیں میدان اجاڑ"

خود سمجھ میں آ جائے گا کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے۔ الانسان خلق سے ہوتے ہی صرف زمین کے ساتھ لپٹ کر رہ گیا وہ اپنا سب سے بڑا کمال یہی سمجھتا ہے کہ زمین کے زیوروں میں ایک زیور اور اس کے گلے کا ہار بن کر اسی کے سینے پر لوٹ پوٹ کر ختم ہو جائے۔ اپنے خیال میں ختم ہو جائے۔ جو خدا کے لئے تھا وہ "زبان خر" کا طوق بن کر گلے میں ہو جاتا تو کہا جا سکتا تھا کہ ایک زندہ جانور کی گردن کا تو ہار ہے مگر وہ تو اسی خیال سے مست ہو رہا ہے کہ کیچڑ اور مٹی کے لئے زیور بن گیا ہوں۔ انفرادی ہستیوں کا حشر اسے بیشک جو نکالنے کا تھا کہ نسل ہے تسلسل اس تسلسل کا بھروسہ اس نے سینے کا مرہم ٹھہرا مرہم بنا ہوا تھا۔ لیکن "ہم بنا دینے والے ہیں (ان سب چیزوں کو جو زمین پر ہیں میدان اجاڑ" یہ عقلی نسل کے اس مرہم کو مجروح سینوں پر دیر تک باقی رہنے دیگا۔ بیس

چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما

میرا خیال تو یہی ہے کہ پہلے رکوع کی یہی تفسیری علامت آدمی کو حیرت اور تعجب میں مبتلا کرنے کے لئے کافی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ عقیدہ ولدیت کے آثار جن حالات کو دنیا میں کھینچ کر لانے والے تھے (جن میں ہم اس وقت مبتلا ہیں) بلاشبہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانے میں آدمی اپنے ایمان کی اور ایمانی قوت سے عمل صالح کے حدود کی حفاظت میں کیا کامیاب ہو سکتا ہے؟ اسی سوال کے جواب میں قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ تم عقیدہ ولدیت کے آثار ہی کو دیکھ دیکھ کر خسران میں مبتلا ہوتے چلے جا رہے ہو، ہم ایک دوسرے سے گھبرا گھبرا کر پوچھتے ہو کہ متاعِ ایمانی کے بچا لینے کی کیا کوئی ممکن صورت رہ گئی ہے؟

عمل صالح کی زندگی گزارنے کی گنجائش کیا اس ماحول میں باقی رہی ہے جسے بتدریج عقیدہ ولدیت کے آثار نے دنیا میں پیدا کر دیا ہے؟ جہاں تک میرا خیال ہے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک گزرے ہوئے واقعہ کو سنا کر قرآن یہ بتانا چاہتا ہے کہ کتنی نازک ترین گھڑیوں میں بچانے والوں نے اپنے ایمان کو بھی بچا لیا تھا اور عمل صالح کی زندگی بھی ان کی بے داغ رہی اور اسی زندگی کے اجر حسن یا اچھے معاوضہ کو بھی مسلسل بغیر کسی انقطاع کے وہ اپنے سامنے پاتے رہے گویا یہ ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ جب سارا ماحول آدمی کا بے ایمانی اور بد عملی سے بھر جائے تو اس وقت بھی ایمان اور عمل صالح کی زندگی کے بچا لینے کا عملی طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟

یقیناً "عقیدہ ولدیت" کے آثار کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس اچنبے کی سب سے بڑی بات اور تعجب کا سب سے بڑا اہم سوال یہی ہو سکتا تھا کہ اس زمانہ میں بھی کیا ایمان اور عمل صالح کو بچا لینے کا کوئی امکان باقی رہ گیا ہے؟ یہ ایک قدرتی سوال ہے جو دلوں میں پیدا ہوتا ہے اور جواب بھی حیرت میں غوطہ دینے والے اسی سوال کا یہ دیا گیا ہے کہ ایمان اس قسم کی آزمائشوں سے گزرتا ہی رہا ہے۔ کہف والے تمہارے جن حالات سے دوچار ہو گئے تھے اور ان ہی حالات میں ایمان و عمل اور اس کے نتائج کے بچا لینے میں وہ کامیاب ہوئے۔ کیا تم اس کو کوئی ایسا عجیب و غریب اور شاذ و نادر واقعہ خیال کرتے ہو جو کسی اصول و قانون کے تحت نہیں بلکہ محض اتفاقاً پیش آ گیا تھا۔

اور یہ ہے میرے نزدیک اصحاب کہف کے قصہ کا اپنے ماقبل کے مضمون سے تعلق اب اس

کے بعد میں اصحاب کہف کے قصہ اور جن الفاظ میں قرآن نے اس قصہ کو بیان کیا ہے نیز جو نتیجے ان الفاظ سے پیدا ہوتے ہیں پھر یہ کہ ان نتیجوں سے اس تعجب کا ازالہ کیسے ہوتا ہے جس میں ہم اور آپ (جو ایسے ناسازگار ماحول میں ایمان و عمل صالح کی زندگی کے بچا لینے کو عجیب بات سمجھے ہوئے ہیں) مبتلا ہیں، بہرحال اب میں ان ہی باتوں کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ شارح الصدور سے دعا ہے کہ دلوں کو کھولے اور جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں دوسروں کی سمجھ میں بھی وہ آ جائے۔

وما توفیقی الا باللہ ان ارید الا الاصلاح ما استطعت۔

قصہ کی تاریخی حیثیت:

الْإِنْسَانُ حَرِيْصٌ عَلٰى مَا مُنِعَ مِنْهُ۔

"جس چیز سے آدمی روکا جاتا ہے اسی کا وہ حریص بن جاتا ہے"

یہ بات در حقیقت کتنی ہی صادق آتی ہو لیکن اصحاب کہف کے قصے میں اس مثالی فقرے کی تاثیری کیفیت واقعی حیرت انگیز ہے۔

کہف والوں کا یہ قصہ نزول قرآن سے پہلے عرب اور عرب کے گردونواح کے ممالک میں مشہور تھا بلکہ گبن نے "تاریخ زوال روما" میں لکھا ہے کہ سریانی زبان میں یہ قصہ لکھا ہوا بھی پایا جاتا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں پروفیسر گویدی اطالوی نے مصری یونیورسٹی میں "محاضرات" کے نام سے عربی زبان میں جو چند لیکچر دیئے ہیں جو مصر ہی سے شائع بھی ہو چکے ہیں اس نے بھی براہ راست سریانی زبان سے جس کا وہ عالم تھا اس قصے کو ان محاضرات میں بھی نقل کیا ہے اور اسماء و اعلام کے متعلق بعض دلچسپ باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔

بہرحال مجھے کہنا یہ ہے کہ یہی واقعہ جو کسی زمانہ میں پیش آیا تھا جیسا کہ قرآن کا دستور ہے اپنے مقصد کی حد تک اس سرگزشت کے خاص اجزاء اور عناصر کو انتخاب کر کے صراحتہً اس کی ممانعت بھی کر دی گئی تھی۔ قرآن ہی میں اس کی ممانعت کر دی گئی تھی کہ جو کچھ بتا دیا گیا اس سے زیادہ خواہ مخواہ قصے کی دوسری تفصیلات کی جستجو اور تلاش میں مسلمانوں کو مبتلا نہ ہونا چاہیے۔

وَلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ أَحَدًا۔

"اور نہ پوچھ ان کے (یعنی اصحاب کے) متعلق ان سے (جو جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں) کسی سے بھی"

جس کا حاصل یہی ہوا کہ قصے کے متعلق جتنی باتوں کا صراحۃً قرآن نے ذکر کیا ہے جس غرض کے لئے قصہ نقل کیا ہے اس کے لئے وہی باتیں کافی ہیں مگر نہ اگلوں نے ممانعت کے اس قرآنی نص صریح کی پرواہ کی اور نہ پچھلوں نے۔ سرگزشت کس لئے قرآن میں پڑھنے والوں کے سامنے رکھی گئی؟ یہی بات نظروں سے اوجھل ہوگئی اور جس نے جاننے کا کچھ بھی دعویٰ کیا اس سے ہمارے اگلوں نے بھی "استفتاء" اور پوچھنے میں کمی نہیں کی اور پچھلوں نے بھی حالانکہ یوں بھی قرآن کے عموم اور اطلاق کو مخصوص اور مقید کرنے میں ایسے غیر قرآنی وسائل سے کام لینے کی ممانعت کی گئی ہے جن میں قرآن ہی جیسی قطعیت نہ پائی جاتی ہو۔ حد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف بھی خبر آحاد کی راہ سے جو باتیں منسوب کی گئی ہیں۔ خواہ محدثین کی اصطلاح "صحیح حدیث" ہی نام ان کا کیوں نہ ہو لیکن عربی مدارس کے ابتدائی طلبہ بھی جانتے ہیں کہ قرآنی نصوص پر اس قسم کی آحاد خبروں سے بھی اضافہ امام ابو حنیفہؒ جائز نہیں سمجھتے تھے۔ بعض اسرائیلی قصوں کے متعلق حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اعلان فرما دیا تھا۔ قاضی بیضاوی نے بھی نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ فرماتے تھے:

مایرویہ القصاص جلدتہ مائۃ وستین۔

"عام قصہ خواں واعظوں میں سے اس اسرائیلی قصہ کو جو بیان کرے گا اسے ایک سو ساٹھ کوڑے لگاؤں گا۔"

مگر آج تک ہماری تفسیروں میں اس قصے ● کو لوگ نقل ہی کرتے چلے آتے ہیں۔

بہر حال دوسرے قصوں میں لوگ خیال کرتے یا نہ کرتے لیکن اصحاب کہف کے ذکر کو بیان کر کے براہ راست قرآن میں مزید پوچھ گچھ کی جب قطعی ممانعت کر دی گئی تھی تو کم از کم اس قصہ کی حد تک تو "قصص" کا قرآنی فرض تھا کہ اپنی عادت سے وہ باز آجاتے مگر جیسا کہ میں

● حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف اوریا کی عورت کے جس قصہ کو منسوب کیا گیا ہے اسی کی طرف اشارہ ہے۔ تفصیل کے لئے "تفسیری مقالات" کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

ماحول میں عجیب واقعہ بن کر ظہور ہو گیا ہے۔ قرآن کے اس مثالی قصہ کو پڑھ کر ہمیں سوچنا چاہیے کہ واقعی کیا وہ اسی قدر عجیب اور انتہائی حیرت انگیز ہے جتنا کہ اس زمانہ میں باور کرلیا گیا ہے یا باور کرایا جا رہا ہے۔ پھر اس قرآنی قصہ کی روشنی میں تعجب کا ازالہ جب ہو جائے تب اس پر غور کرنا چاہیے کہ جس "من لدنی باس شدید" کی دھمکی قرآن نے عقیدہ ولدیت والی قوموں کو دی ہے اور اسی عقیدہ کے آثار کے آخری انجام کا نقشہ صعید جرز (اجاڑ میدان) کی شکل میں جو اس نے پیش کیا ہے کیا ان سے پیدا ہونے والے مصائب و آفات کا مقابلہ ایمان و عمل صالح کی اس زندگی سے کیا جا سکتا ہے جسے قرآن ہی نہ ختم ہونے والے اجر حسن یا اچھے معاوضہ کا سرچشمہ قرار دے رہا ہے۔ اور اس قید کے بغیر قرار دے رہا ہے کہ ایمان و عمل صالح کی زندگی کے ان نتائج کا ظہور اسی حیات ارضی میں ہوتا ہے یا مرنے والوں کے سامنے وہ آئیں گے۔

جیسا کہ میں عرض کرتا چلا آ رہا ہوں کہ اصحاب کہف کے قصے کو میرا خیال یہی ہے کہ ان ہی سوالوں کے حل اور جواب کے لئے ہمیں پڑھنا چاہیے۔ نہیں کہہ سکتا کہ جن الفاظ میں یہ قصہ قرآن میں بیان کیا گیا ہے ان سے اور کتنی قیمتی نتائج نکل سکتے ہیں یا نکالے جا سکتے ہیں لیکن اب تک جن چیزوں کی یافت سے سرفراز ہوا ہوں انہیں پیش کر دیتا ہوں۔

قرآن اٹھا لیجئے عربی سمجھ میں نہ آتی ہو تو کسی ترجمہ کو پڑھ لیجئے اصحاب کہف کے قصے میں پہلی بات آپ کو یہ نظر آئے گی کہ بجائے ایک کے مجمل و مفصل دو مستقل تعبیروں میں قرآن نے اس قصہ کو بیان کیا ہے۔

"جب پناہ لی جوانوں نے کہف (کھوہ) میں تو کہا انہوں نے اے ہمارے پروردگار عطا کر اپنے پاس سے ہمیں رحمت اور مہیا فرما ہمارے کام کے متعلق ہمیں سوجھ بوجھ تب تھپک دیا ہم نے ان کے کانوں پر کھوہ میں گنتی کے چند سال پھر اٹھایا ہم نے ان کو تا کہ ہم یہ جانیں کہ دونوں جتھوں میں سے کس نے احصا کیا اس مدت کا جس میں وہ ٹھہرے (اس کھوہ میں)"

یہ قریب قریب ترجمہ ہے ان قرآنی الفاظ کا یعنی:

إِذْ أَوَى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوا رَبَّنَا آتِنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ

أَمْرِنَا رَشَدًا ۝ فَضَرَبْنَا عَلَىٰ آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا ۝ ثُمَّ بَعَثْنَاهُمْ لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصَىٰ لِمَا لَبِثُوا أَمَدًا۔

قصے کی مجملاً تعبیر ہے جس کا نام میں نے اجمالی تعبیر رکھا ہے۔ گویا کل چار فقرے یا آیتوں پر یہ تعبیر مشتمل ہے۔ اس کے بعد یہ فرماتے ہوئے کہ ہم ان کا قصہ حق کے ساتھ تمہیں سناتے ہوں، قصے کی تفصیلی تعبیر قرآن میں پائی جاتی ہے جو کافی طویل ہے عام طور پر چھوٹی تقطیع والے قرآن کے آدھے صفحے سے زیادہ جگہ اس نے گھیر لی ہے۔

پہلے اجمال اور پھر تفصیل میں حکمت

جاننے والے جانتے ہیں کہ اختصار پسندی قرآن کی ایک بڑی خصوصیت ہے لیکن اس خاص قصے کے متعلق یہ طریقہ کہ پہلے اجمالی تعبیر میں قصے کو ادا کیا گیا اور پھر اجمال کے بعد اسی قصے کو تفصیلی رنگ عطا کیا گیا ہے یہ بجائے خود ایک نئی بات ہے۔ اجمالی اور تفصیلی تعبیروں کے مشتملات پر غور کرنے سے پہلے سوچنے کی بات یہی ہے کہ ایک ہی قصے کو اجمالی اور تفصیلی دو تعبیروں میں ادا کرنے کی آخر کیا مصلحت ہے؟ اس مصلحت کا صحیح علم تو خود قرآن کے نازل کرنے والے ہی کے پاس ہوگا۔ ناچیز کی نظر جو کچھ پا سکی اس سلسلہ میں آپ کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ تفصیلی تعبیر کی اس آیت

إِنَّهُمْ إِن يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوكُمْ أَوْ يُعِيدُوكُمْ فِي مِلَّتِهِمْ۔

"(ترجمہ) اگر وہ (یعنی دشمن) تم سے واقف ہو جائیں گے تو تم کو سنگسار کر دیں گے یا واپس لے لیں گے اپنی ملت کی طرف یعنی مرتد بنا لیں گے"

سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی ایمانی آزمائش اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ یا جان سے ہاتھ دھو لیں یا اپنے دین سے تعلق قطع کر کے مرتد بن جائیں۔ یہ تنہا ایمانی آزمائش کی شدت کا آخری نقطہ ہو سکتا ہے لیکن اسی جز کا اضافہ تفصیلی تعبیر میں کیا گیا ہے۔ برخلاف اس کے اجمالی تعبیر میں صرف اس کا ذکر ہے کہ پناہ لینے کے لئے کہف والے کھوہ میں چلے گئے تھے لیکن کس چیز سے پناہ لینے کے لئے انہوں نے ایسا کیا تھا اس کا ذکر اجمالی تعبیر میں نہیں ہے۔ صرف سبق کے

فحوائے سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ایمانی آزمائش ہی کا یہ قصہ تھا کیونکہ اس کا ذکر اسی سوال کے بعد کیا گیا ہے جو عقیدہ ولدیت کے آثار کے مشاہدہ کے بعد فطرتاً دلوں میں پیدا ہوتا ہے کہ آفات ومصائب کا جو سلسلہ ان آثار سے دنیا میں پیدا ہوگا ان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی تدبیر قرآن نے ایمان وعمل صالح کی زندگی کو بتایا ہے لیکن ان آثار کے پیدا کئے ہوئے ماحول میں ایمان ہی کا بچانا تو مشکل ہے۔ اسی سوال کے جواب میں قرآن نے یہ فرماتے ہوئے کہ ان حالات میں ایمان وعمل صالح کی زندگی کے بچا لینے پر تمہیں تعجب کیوں ہوتا ہے اس قسم کے واقعات پہلے بھی پیش آچکے ہیں اور توفیق یافتہ بندوں نے اپنا ایمان بچایا ہے۔ بہرحال سابق و لاحق آیتوں کے تعلق سے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کہف کی طرف پناہ گزینی کے لئے وہ ایمانی آزمائشوں ہی کی وجہ سے روانہ ہوئے تھے لیکن ان کے فعل کے اس محرک کا صراحتاً تذکرہ قصہ کی اجمالی تعبیر میں نہیں پایا جاتا۔

میرا خیال یہی ہے کہ دنیا میں جیسے عموماً چیزوں کی دو حدیں ہوتی ہیں ایک ابتدائی اور انتہائی اسی طرح ایمانی آزمائش میں دیکھا جاتا ہے کہ انتہائی حد تو اس کی وہی ہے کہ جان دیجئے یا ارتداد اختیار کیجئے اور ابتدائی حال اس کا اس ماحول سے شروع ہوتا ہے جس میں گمراہی وضلالت کا تسلط اکثریت پر ہو جاتا ہے۔ جان یا مال کا خطرہ تو پیش نہیں آتا، مرتد ہونے پر خواہ مخواہ مجبور تو کسی کو کوئی نہیں کرتا لیکن ملک کی عام سوسائٹی اور مجلسی ماحول سے کنارہ کشی اختیار کئے بغیر دین و ایمان دوران کے اقتضاؤں کی تکمیل بظاہر ناممکن یا کم از کم سخت ترین قسم کی دشواریوں کی زنجیروں میں جکڑی نظر آتی ہو۔ سمجھ میں یہی آتا ہے کہ شاید تفصیلی تعبیر میں ایمان آزمائش کی آخری حد کے مشکلات پیش نظر ہیں اور اسی کے مقابلہ میں ایمانی آزمائش کی ابتدائی کیفیت کی دشواریوں سے نجات پانے کی طرف اجمالی تعبیر میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اجمالی تعبیر کے مشتملات:

اب آیئے اس نقطہ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے قصہ کی اجمالی تعبیر کے مشتملات اور جو نتائج ان سے پیدا ہوتے ہیں ان پر غور کریں۔

ظاہر ہے کہ یہی بات اس تعبیر میں بھی بیان کی گئی ہے کہ ایمانی آزمائش میں مبتلا ہونے والوں نے اپنے علاقے کی عام سوسائٹی سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا اور اسی فیصلہ کے مطابق وہ "اہل کہف" (کھوہ) میں پناہ لینے کے لئے چلے گئے یعنی ایسے مقام کا انتخاب بود و باش کے لئے کیا جہاں اس عہد کی عام بے ایمان اور حرام ناشناس سوسائٹی کی گندگیوں سے محفوظ رہنے کی ان کو توقع ہو سکتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ایمانی آزمائش کے ان حالات میں علیحدگی اور "کنارہ کشی" کی یہ تدبیر بذات خود کوئی اہم بات نہیں ہے بلکہ یہی بات ان حالات میں دل میں اگر آتی ہے تو یہی آتی ہے کہ

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

مگر اس شاعرانہ خیال کی خوش گواری اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک کہ خیال صرف خیال ہے لیکن خیالی حدود سے نکل کر عمل کی سرحد میں قدم جس وقت رکھا جاتا ہے اس وقت محسوس ہوتا ہے کہ یہ خیال اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ شاعروں نے اس کو مشہور کر رکھا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ انسان فطرتاً انس پسند پیدا ہوا ہے تنہا کسی ایسی جگہ زیادہ دن تک وہ ٹھہر نہیں سکتا جہاں انس حاصل کرنے کے لئے اس کے ہم جنس ہم مذاق افراد کا ملنا نا ممکن ہو جائے۔ "آدمی فطرتاً مدنی الطبع ہے" اس کا بھی مطلب یہی ہے اور اس سے بھی زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ عام سوسائٹی سے کنارہ کشی کے بعد معاشی سہولتوں کے بھی دروازے عموماً بند ہو جاتے ہیں حالانکہ سد رمق ہی کی حد تک سہی جس سے جان کا رشتہ بدن کے ساتھ باقی رہے کم از کم اس کی ضرورت ہر اس شخص کو ہوتی ہے جو فرشتہ نہیں بلکہ آدمی بنا کر دنیا میں پیدا کیا گیا ہے اور تیسری بات تجربہ کی اس سلسلہ میں وہی ہے کہ جس کا مشاہدہ بداوت کی زندگی رکھنے والوں میں پیش کیا گیا ہے۔ قرآن میں بھی بداوت کی اسی زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ذہنی پستی اس حد تک زوال پذیر ہوتے ہوتے پہنچ جاتی ہے کہ

أَجْدَرُ أَلَّا يَعْلَمُوا حُدُودَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ

"زیادہ مستحق ہو جاتے ہیں (بدوی زندگی رکھنے والے) اس امر کے کہ اللہ کی اتاری

کہ انہوں نے اس زندگی میں قدم رکھتے ہوئے ہر طرف سے ٹوٹ کر اپنی پرورش کے حقیقی سرچشمہ کے ساتھ لو لگائی تھی فرمایا گیا ہے کہ "فقالوا ربنا" (انہوں نے کہا اے ہمارے پروردگار) جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ربوبیت اور پرورش کے جھوٹے یا مجازی مظاہر ہیں ان سے یک لخت بے تعلق ہو کر اس نئی زندگی کی راہ میں اپنے "رب صادق" اور "سچے پروردگار" کے دامن کو انہوں نے تھام لیا تھا۔ وہ عام اسباب کی دنیا سے کنارہ کش ہو رہے تھے لیکن جو اسباب کا محتاج بنا کر پیدا کیا گیا ہے وہ ان سے الگ ہو کر کیسے جی سکتا ہے؟ اسی لئے آپ دیکھ رہے ہیں کہ انہوں نے مجازی اسباب سے تو علیحدگی اختیار کی تھی لیکن جو مسبب الاسباب اور اسباب کا پیدا کرنے والا ہے اس کو پوری طاقت کے ساتھ پکڑے ہوئے تھے اور اسی کے ساتھ اپنی احتیاجی ان عام نتائج کے بعد جو حقیقت خصوصی توجہ کے مستحق ان کی دعا کے دونوں فقرے ہیں جن کا پہلا فقرہ ہے۔

رَبَّنَا آتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً۔

"اے ہمارے پروردگار! عطا فرما اپنے پاس سے ہمیں "رحمت"۔

اور دوسرا فقرہ یہ ہے کہ:

وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا۔

"اور فراہم فرما! ہمارے معاملہ میں "رشد"

"رشد" عربی زبان کا لفظ ہے جسے قرآن میں بار بار استعمال کیا گیا ہے خصوصاً "غیّ" کے مقابلہ میں "الرشد" کے اسی لفظ کو استعمال کر کے قرآن یہی بتا رہا ہے کہ انسان کی فکری و نظری قوت سے اس کا تعلق ہے۔ یہی فکری و نظری قوت جب غلط نتیجہ تک پہنچتی ہے تو اس کا نام "غیّ" ہے اور ٹھیک اصل حقیقت تک فکر و نظر کی رسائی کی صلاحیت کا نام "رشد" ہے۔ بہرحال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دعا کے دوسرے فقرے کو تعلق چونکہ باطنی احساسات اور معنوی رجحانات سے ہے تو مطلب اس کا یہی ہوا کہ سوسائٹی کے گندے اور خبیث رجحانات کے مقابلہ میں جس ایمانی مسلک کی توفیق ان کو میسر آئی تھی جس کی تعبیر "امرنا" کے لفظ سے ادا کی گئی ہے اپنے اسی ایمانی مسلک کے متعلق حق تعالیٰ سے وہ آرزو کر رہے تھے کہ کجی اور گمراہی سے بچاتے

ہوئے ان کی فکر و نظری قوتوں میں رشد کی روشنی پیدا کی جائے یعنی ایمانی ترقی اور باطنی سلوک کی راہ میں چاہتے تھے کہ جو قدم بھی اٹھے رشد کی یہی معنوی روشنی ان کو آگے بڑھاتے ہوئے لئے چلی جائے۔ اس تشریح کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی دعا کے پہلے فقرے میں "رحمت" کا جو لفظ پایا جاتا ہے اس کا مطلب بھی متعین ہو جاتا ہے' مطلب یہ ہے کہ یوں تو رحمت اور وہ بھی رب السموت والارض کی قرآنا ہر چیز میں سمائی ہوئی ہے۔ وسعت رحمتی کل شیء (ہر شئے میں میری رحمت پھیلی ہوئی ہے) قرآن ہی کی آیت ہے مگر یہاں "رحمت" کے اس لفظ کا استعمال جب "رشد" کی معنوی و باطنی صفت کے مقابلہ میں کیا گیا ہے تو اس قرینے سے یہی سمجھنا چاہیے کہ معنوی و باطنی ضرورتوں کے مقابلہ میں ان حاجتوں کے متعلق پروردگار عالم کی رحمت کی استدعا وہ کر رہے تھے جن کی تعبیر ہم ظاہری اور معاشی ضرورتوں سے کر سکتے ہیں' حاصل یہی ہوا کہ ملک کی عام سوسائٹی سے علیحدگی کے بعد قدرتاً جیسا کہ عرض کر چکا ہوں یہی دو باتیں سب سے زیادہ اہم ہوتی ہیں یعنی معاشی ضرورتوں کا مسئلہ اور فکری و نظری قوتوں کے انحطاط و زوال کا خطرہ الغرض ظاہر و باطن کی ان ہی دونوں اہم ضرورتوں میں حق تعالٰی کی پشت پناہیوں کی درخواست پر ان کی یہ دعا کم از کم اس خاکسار کو مشتمل نظر آ رہی ہے۔

اس کے بعد میرا خیال یہ ہے کہ "رشد" کی درخواست دعا کے دوسرے فقروں میں جو ان کی طرف سے پیش ہوئی ہے اگرچہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی آرزو کی تکمیل کے لئے قدرت کی طرف سے کہفی زندگی میں کیا کیا انتظامات کئے گئے تھے مگر بظاہر جہاں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اپنے نفوس کی پونجی ایک دوسرے کے ساتھ حق ❶ اور صبر کی تواصی کے فرض کو ادا کر کے جیسا چاہیے ان کے "رشد" کی حفاظت کرتی ہوئی وہ ہیں اس پر کیوں تعجب کیا جائے کہ ایمانی راہ کے دوسرے چلنے والے جو ان سے پہلے گزر چکے تھے ان کی تعلیمات اور مشوروں سے بھی مستفید ہونے کا موقع ان کی رتی یادگاروں سے ان کو عزت اور کنارہ کشی کی زندگی میں مل گیا ہو بالفاظ دیگر ان کے پاس دوسرے انبیاء علیہم السلام کے صحیفوں میں سے کچھ صحائف و مخطوطات اور ان ہی

❶ حق اور صبر کی ایک دوسرے کو وصیت و تلقین اہل ایمان کی ایک قرآنی خصوصیت ہے۔ سورۃ العصر میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

تفسیروں کے سامنے والوں کی لکھی ہوئی کچھ کتابیں ہوں جن سے ان کی رشدی بصیرت روشنی حاصل کرتی ہو تو اس کے انکار کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی بلکہ یہ تو "اصحاب الکہف" کے ساتھ "الرقیم" کے لفظ کی طرف بھی ان ہی اضافت کی گئی ہے۔ تفسیر کی عام کتابوں میں حضرت ابن عباسؓ کی طرف جن کے متعلق اگرچہ یہ قول بھی منسوب کیا گیا ہے کہ

لا ادری ما الرقیم

"میں نہیں جانتا کہ "رقیم" کیا چیز ہے۔"

تو ان ہی تفسیروں میں ان ہی کا یہ قول بھی ملتا ہے، درمنثور میں ابن المنذر اور ابن ابی حاتم کے حوالے سے نقل کیا ہے:

"من طریق علی عن ابن عباسؓ قال الرقیم الکتاب" (ص ۲۱۴ ج ۴)

علی کی یہ روایت ابن عباسؓ سے یہ ہے کہ "الرقیم" الکتاب ہے۔

علی جن کا پورا نام علی بن ابی طلحہ الہاشمی ہے جو جانتے ہیں کہ ابن عباسؓ (کے تفسیری اقوال کی روایت میں ان کا کیا مرتبہ ❶ ہے) کی تفسیر میں کتنی قوت ہے۔

بہرحال میری غرض یہی ہے کہ "الرقیم" سے کیا مراد ہے؟ گر اس کا متعین کرنا ضروری ہو تو لغت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اور لکھی ہوئی چیز کو "الرقیم" کہتے تھے اور صحابہؓ کے اقوال میں بھی مستند ترین قول یہی ہے کہ "الرقیم" سے مراد الکتاب ہے ایسی صورت میں کیوں نہ سمجھا جائے کہ ان کی دعا کے دوسرے فقرے یعنی اپنے امر کے متعلق "رشد" کی جس روشنی کے مہیا کرنے کی درخواست انہوں نے بارگاہ الٰہی میں پیش کی تھی اسی درخواست کی منظوری "الرقیم" کو مہیا کر کے قدرت کی طرف سے ہوئی تھی۔

خلاصہ یہ کہ کہفی زندگی کی یہ دونوں اہم ضرورتیں یعنی معاشی سہولتیں ان کے لئے من لدنی

---

❶ اسی سے اندازہ کیجئے کہ امام احمد بن حنبلؒ فرمایا کرتے تھے کہ مصر میں علی ابن ابی طلحہ کی روایت سے ابن عباسؓ کی تفسیر کا جو نسخہ پایا جاتا ہے اگر صرف اسی نسخہ کو حاصل کرنے کے لئے مصر کا کوئی سفر کرے تو یہ کوئی بڑی بات نہ ہوگی (اتقان) بخاری نے بھی ابن عباسؓ کے تفسیری اقوال کے نقل کرنے میں اسی طریقہ کو ترجیح دی ہے۔

تھے۔ جس کے جی میں جو بھی آتا تھا بنا کر اسے پھیلا دیا کرتا تھا اور ایک سے دوسرے تک پھیلتے ہوئے خبریں زمین کے کناروں تک چلی جاتی تھیں۔ راوٗکا بہ راہی اس صنعت کا روزنامہ ہوتا تھا' جدھر سے وہ آتا تھا اپنے اپنے پر بیٹھے والے کی کان میں کچھ ڈالتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا تھا۔ آج اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس راہ سے انسانی زندگی کے گراں قدر اوقات کو شیطان کس بے دردی کے ساتھ برباد کر رہا تھا اور وقت کی بربادی تو خیر ایک منفی حالت ہے۔ ان ہی راہوں سے وساوس و اوہام کے طوفان اور ان کی پیدا کی ہوئی تاریکیوں اور ان کی پھیلائی ہوئی گندگیوں کا کوئی ٹھکانہ ہے۔ فلسفہ اور حکمت' شعریت و خطابت اور کیا کیا بتایا جائے کن دلکش اور مہیب ناموں سے انسانی دل و دماغ کو مرعوب کرنے کی کوشش ان ہی انہی بوالہوسیوں کی راہ سے نہیں کی گئی یا نہیں کی جا رہی ہے۔

اوروں کا خیال کچھ ہی ہو لیکن اپنا تجربہ تو یہی ہے کہ "رشد" و "ہدایت" کی لائی ہوئی روشنی سے صحیح طور سے استفادہ ان لوگوں کے لئے مشکل ہو جاتا ہے جنہوں نے اسی "روشنی" کے ساتھ ان ظلمات اور تاریکیوں کی موجوں کو بھی اپنے اندر گزرنے کے لئے آزادی دے رکھی ہو' جو فاسد سوسائٹی کے دل و دماغ سے نکل نکل کر ماحول کو متاثر کر رہی ہوں۔

کچھ بھی ہو اپنا ذہن تو مذکورہ بالا آیت جس میں فرمایا گیا ہے کہ چند سال کیلئے ان کے کانوں کو ہم نے تھپک دیا تھا۔

فَضَرَبْنَا عَلَىٰ آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا۔

اس سے ادھر منتقل ہوتا ہے کہ رشد کی جس روشنی کی فراہمی کی استدعا بارگاہ ربانی میں ان لوگوں نے پیش کی تھی اسی کے سلسلے میں اور جو قدرتی تائید یں ان کو میسر آئی ہوں گی ان ہی کے ساتھ شاید یہ بھی کیا گیا کہ اپنے ملک کی سوسائٹی کے جس متعفن اور سڑے ہوئے ماحول سے نکل کر کہفی زندگی کے نیچے انہوں نے پناہ لی تھی۔ اس سوسائٹی میں گزرنے والے حوادث و واقعات اور اس میں پیدا ہونے والے گندے افکار و خیالات سے بھی ان کے کانوں کا رشتہ توڑ دیا گیا تھا اور بجائے اس کے کہفی زندگی میں ان کے "رشد" کی بقا اور ارتقاء کا جو سامان پیدا کیا گیا تھا اسی میں وہ مگن تھے۔

اور میرا خیال تو یہ ہے کہ اسی سے

ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا۔

پھر ہم نے ان کو اٹھایا تاکہ ہم جانیں (یعنی اس ❶ علم کو ظاہر کریں) کہ دونوں فریق میں سے کس نے اس مدت کا احصاء کیا جس میں وہ غار میں ٹھہرے۔"

قرآن کی اس آیت کا مطلب بھی بآسانی سمجھ میں آ جاتا ہے جس پر قصہ کی اجمالی تعبیر کو قرآن نے ختم کیا ہے۔

صرف ایک لفظ یعنی "احصی" سے کیا مراد ہے؟ اس کو طے کر لیجئے بات ان شاء اللہ آپ کی سمجھ میں بھی آ جائے گی۔ یوں تو "احصی" کے مادہ سے ماخوذ ہے، شمار کرنا اور گننا جس کا ٹھیٹ لغوی ترجمہ ہے، عام مترجمین نے یہی ترجمہ درج بھی کیا ہے لیکن نصب یہی "احصی" ماضی کا صیغہ "احصنی" والی مشہور حدیث میں بھی مستعمل ہوا ہے۔ لغت حدیث کی کتاب "نہایہ" میں ابن اثیر نے اس کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اطاق قیام حقها واطاق العمل بمقتضاها۔"

"(اسماء حسنیٰ کا جو حق تھا) اس حق کو ادا کیا اور ان کا جو مقتضیٰ تھا اسے پورا کیا۔"

راغب نے بھی "مفردات" میں قرآنی لفظ "لن تحصوه" کو درج کر کے کی قرأت سے اس کی شرح کی ہے پھر حدیث:

نفس تنجيها خير لك من امارة لا تحصيها۔

---

❶ یہ قرآن کا ایک خاص طریقہ ادا ہے جسے وہ عموماً استعمال کرتا ہے۔ یہ سوچ کر کہ وقوع سے پہلے کے واقعات کا علم حق تعالیٰ کو نہیں ہوتا، بالکل بے بنیاد ہے تاکہ ہم جانیں میں سے یہ کیسے سمجھ لیا گیا ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ اس واقعہ سے ناواقف تھے پھر آپ کا یہ دوسری اضافہ ہے کہ مفہوم مخالف پیدا کر کے قرآن کی طرف کسی بات منسوب کر دیں جو اس میں نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی چیز کا علم نہیں ہوتا ہے لیکن دوسرا یہ تک جانتا کہ میں اس سے واقف ہوں تو اس موقع پر آدمی اپنے علم کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے "جناب میں جانتا ہوں کہ آپ نے فلاں کام کیا ہے" اس وقت مقصد یہی ہوتا ہے کہ مخاطب کو اپنے عالم ہونے کی خبر دی جائے نہ کہ واقعہ کا اسی وقت علم حاصل ہوا ہے اس کی خبر اسی طریقہ بیان سے دی جاتی ہے۔ دوسری زبانوں میں بھی ایسے محاورات مستعمل ہیں۔

اپنے عقیدہ کو ثابت رکھ کر بچ جائے۔ بخاری کی مشہور روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

یوشك ان یكون خیر مال المسلم غنم یتبع بها شعف الجبال و مواقع القطر یفر بدینه من الفتن۔

"قریب ہے کہ مسلمانوں کا بہترین مال بکریاں ہوں گی جن کے پیچھے پیچھے پہاڑوں کی چوٹیوں اور پانی کے چشموں کی طرف اپنے دین کو فتنوں سے بچانے کے لئے بھاگا پھرے گا۔"

حدیث کا مفاد بھی یہی ہے۔ پیشین گوئی کی گئی ہے کہ مستقبل میں بھی مسلمانوں کو اس قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑے گا جیسے مکی زندگی کے دور سے نبوت کبریٰ عام جب گزر رہی تھی۔ تو قرآن ہی میں اسی عہد کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ ○ وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ ○ وَإِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمُ انْقَلَبُوا فَكِهِينَ ○ وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَالُّونَ ○ (المطففین)

"جو مجرم ہیں وہ ایمان لانے والوں پر ہنستے ہیں اور جب ان پر گزرتے تو ان کے متعلق باہم ایک دوسرے سے چشمک زنی کرتے ہیں اور جب واپس لوٹتے ہیں اپنے گھروں کی طرف تو باتیں بناتے ہیں اور جب ایمان والوں کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہی لوگ گمراہ ہیں۔"

صحابہ کرامؓ کے سامنے ایسے واقعات گزر رہے تھے کہ سنگ و خشت سے بنی ہوئی مسلمانوں کی کوئی عبادت گاہ نہیں بلکہ اسلام کے سارے احترامی عناصر کا تقدس جس ذات گرامی کے احترام و تقدس کے ساتھ وابستہ ہے یعنی خود سرور کائنات ﷺ تھے ان کی پشت مبارک پر اونٹ کی بچہ دانی ڈال دی گئی ہے اور صحابہ کرامؓ جیسے تروتازہ ایمان رکھنے والے حضرات پیغمبر کو اس حالت میں دیکھتے ہیں۔ ابن مسعودؓ جیسے جلیل القدر صحابی کا بیان امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اس حال کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وانا انظر ولا اغنی عنه لو كانت لی منعة۔

"میں رسول اللہ ﷺ کو اس حال میں دیکھتا اور کچھ کام نہ آ سکتا، کاش میرے پاس مدافعت کی قوت ہوتی"

تفصیلی تعبیر کے عمومی مشتملات:

غرض قصہ کی اجمالی تعبیر سے صرف اتنی بات معلوم ہوئی کہ اپنی دینی زندگی کو بچانا چاہے تو ہر حال میں بچا لیا جا سکتا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا اصحاب کہف کی سرگزشت کا تعلق جہاں تک میرا خیال ہے اس بشارت سے ہے جس میں اطمینان دلایا گیا ہے کہ ایمان و عمل صالح کی زندگی کے اجر حسن یا نتائج و ثمرات سے اہل ایمان ہر حال میں مستفید و متمتع ہوتے رہتے ہیں۔ ماکثین فیہ ابدا۔ (ٹھہرے رہیں گے اس میں (یعنی ایمان و عمل صالح کے نتائج و ثمرات میں) قائم و دائم رہیں گے)

حدیث کے الفاظ سے بھی سمجھ میں آتا ہے اصحاب کہف کے قصہ کی تفصیلی تعبیر قرآن کے جس بیان کو میں قرار دے رہا ہوں، اگر غور کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ اس دعویٰ کے ثبوت کی گویا ایک تاریخی مثال ہے بتایا گیا ہے کہ اپنے رب پر ایمان لاتے ہوئے یہ ایمان جو آدمی کا اختیاری فعل ہے نہ کہ جسم کا اختیاری فعل جیسے نور یا روشنی چاروں طرف سے ہمیں گھیرے ہوتی ہے لیکن روشنی کے جاننے کا جو قدرتی ذریعہ بینائی کی قوت ہے آپ کو اختیار ہے روشنی کے ساتھ متعلق کر کے اس کو دیکھنا چاہئے تو آنکھیں بند کئے پڑے رہئے ایسی صورت میں روشنی جس سے دنیا جگمگا رہی ہے آپ کو نظر نہ آئے گی۔ اس طرح آپ کا رب اور آپ کی پرورش کرنے والی قوت بھی گو آپ پر محیط ہے آپ سے قریب ہے مگر اپنے اسی رب اس کی ذات و صفات، افعال و مرضیات کی یافت کا جو قدرتی طریقہ ہے یعنی نبوت و رسالت پر اعتماد اس وقت تک آپ کا ایمانی حاسہ اپنے رب کے پانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ رب کی یافت کے اس قدرتی طریقہ اور قدرتی ذریعہ کو کام میں نہ لایا جائے۔

بہرکیف قصہ کی تفصیلی تعبیر میں یہی بیان کیا گیا ہے کہ نوجوانوں کی وہی ٹولی جن کو ہم اصحاب کہف کہتے ہیں کہ وہ اپنے پالنے والی قوت یعنی اپنے رب پر ایمان لانے میں کامیاب

حق کے ساتھ۔ یہ ایک قرآنی محاورہ ہے اور مختلف مقامات معانی میں استعمال کیا گیا ہے۔
یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ قصہ صرف برائے قصہ نہیں سنایا جائے گا بلکہ سنانے کا مقصد یہ ہے
کہ ذی فہم اپنی سمجھ اور اپنے اپنے ظرف کے مطابق لوگ اس قصہ سے حصہ حاصل کریں۔ آگے اس
قصہ کی تفصیل شروع ہوتی ہے۔ پہلی خبر اس سلسلہ میں یہ دی گئی ہے کہ:

إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ۔

"(یہ کہف والے) چند نوجوان تھے ایمان لے آئے تھے وہ اپنے رب پر۔"

"اپنے رب پر ایمان لانا" یہی ان نوجوانوں کا اختیاری فعل تھا۔ چاہتے تو جیسے ان کی قوم
کی اکثریت اپنی اس پرورش کرنے والی قوت سے لاپروائی اور بے تعلقی کا طریقہ اختیار کیے
ہوئے زندگی گزار رہی تھی، وہ بھی اسی طریقہ کو اختیار کر لیتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اور اپنے
رب کی ربوبیت کا جو قدرتی مطالبہ ان کا ہے اس کا رشتہ "رب" سے قائم کر کے مومن بن گئے۔
یہاں تک تو ان کا کام تھا جسے ان نوجوانوں نے انجام دیا۔ اب سنئے اس ایمان کا اجر حسن ان کے
سامنے کن کن شکلوں میں مسلسل آتا چلا گیا۔ اس کے بعد اطلاع دی گئی ہے۔

"وَزِدْنٰهُمْ هُدًى"

"اور ہم نے ہدی (یعنی درست بینی اور حق یابی) میں ان کو بڑھا دیا۔"

سمجھا آپ نے یہ کیا کہا گیا؟ نوجوانوں نے اپنے رب پر ایمان لانے کے فرض کو پورا کیا
تھا۔ تب اس کا معاوضہ اور اجر حسن ان کو ان کے رب کی طرف سے ایک معنوی دولت اور باطنی نعمت
کی شکل میں عطا کیا گیا۔ یعنی باہر میں تو بظاہر کسی قسم کی کوئی ایسی چیز ان نوجوانوں کے سامنے نہیں
آئی جسے دیکھنے والے ان کے ایمان کا اجر و معاوضہ قرار دیتے لیکن اندر ہی اندر ان کی بصیرت کی
روشنی میں قدرت کی طرف سے اضافہ شروع ہوا۔ یہاں سے پہلے جن باتوں کا تصور بھی ان کے
لئے دشوار بلکہ شاید ناممکن تھا ان ہی کو وہ پا رہے تھے اور قدرت کی پیدا کی ہوئی اس معنوی روشنی
میں ان ہی کو وہ دیکھ رہے تھے تا آنکہ باطنی سلوک کی اس راہ میں چلتے ہوئے وہ ایک ایسے مقام
تک پہنچ گئے جس کی خبر قرآن نے اسی کے بعد ان الفاظ میں دی ہے، فرمایا گیا ہے:

"وَرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ"

"اور ہا تھ دیا ہم نے ان کے قلوب پر یعنی دلوں پر"

"قلوب" قلب کی جمع ہے۔ یہ وجود انسانی کے اس عنصر کی تعبیر ہے جس کا کام ہی انقلاب ہے یعنی یہ کہ الٹتا پلٹتا رہے۔ یہی ہے لامحدود اسباب کا یہ گھنا جنگل جس کا نام عالم یا دنیا ہے۔ اس عالم کے رب سے جب تک انسانی وجود کا یہ چنچل حصہ بیگانہ اور نامانوس رہتا ہے اس وقت تک بجز اس بات کے کہ ایک سبب سے منتقل ہو کر دوسرے سبب اور دوسرے سے تیسرے سبب کی وادی میں سراسیمہ ہو کر بھٹکتا رہے بلکہ سراسیمگی وحیرانی وسرگردانی میں جس کی حرکت جتنی زیادہ تیز ہوتی ہے وہی رب پر ایمان سے محروم رہ جانے والی مجلسوں میں ستائش اور شاباشی کا زیادہ مستحق ٹھہرایا جاتا ہے۔

لیکن ایمان کی راہ سے اپنی پرورش کرنے والی قوت کو جو پالیتے ہیں اور اس ایمان کے معاوضہ میں معنوی بصیرت کی جو روشنی ان کو رب کی طرف سے ارزانی ہوتی ہے اس باطنی روشنی کی شدت جس حد تک بڑھتی جاتی ہے اسی حد تک ان کے آگے اصل حقیقت اور "ربوبیت" کا صادق نکھار، بے نقاب ہونے لگتا ہے؟ ایں کہ وہی "قلب مضطرب" یا انسانی وجود کا "بے چین عنصر" قلب سکون وقرار کے ایسے خنک برف خانے میں اپنے آپ کو پاتا ہے جس کی صحیح تعبیر یہی ہو سکتی ہے کہ ہر طرف سے توڑ کر اسی قلب کو "ربوبیت" کے حقیقی سرچشمہ کے ساتھ گویا باندھ دیا گیا ہے۔

طمانیت وسکون کی اسی کیفیت کو لوگ روپے کے ڈھیروں بینک کے پاس بکوں اور سرمایہ کی دوسری منقولہ وغیر منقولہ جائیدادوں کے اندر ڈھونڈتے ہی رہتے ہیں لیکن اپنے رب کے ساتھ قلب کے مربوط ہو جانے کی مذکورہ بالا باطنی نعمت سے جو سرفراز کیا جاتا ہے اس کے پاس باہر میں خواہ کچھ ہو یا نہ ہو لیکن اپنے باطن کو ہر چیز سے کسا کسایا جاتا ہے دماغ نام رکھئے یا دل عقل کہئے یا دانش ڈانواڈول رہنے کی لعنت سے اس کو نجات مل جاتی ہے اور اسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے اقدامات کی جرات اس میں پیدا ہو جاتی ہے جن کو رب سے ٹوٹے ہوئے غیر مربوط قلب والے شاید سوچ بھی نہیں سکتے خود ان ہی یعنی نوجوانوں کے متعلق آگے ان کے قصہ کی تفصیلی تعبیر میں جو یہ خبر دی گئی ہے کہ

اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا۔

"(اور دیکھو) جب وہ کھڑے ہوئے پھر بولے ہمارا پالنے والا آسمانوں اور زمین کا پالنے والا ہے۔ ہرگز نہیں اس کے سوا ہم کسی الٰہ کو پکاریں گے اگر ایسی بات ہم نے کہی تو درحقیقت حق سے ایک بڑی ہٹی ہوئی بات ہوئی۔"

ہدایت کی باطنی روشنی جوانوں میں بڑھائی گئی تھی اسی روشنی میں انہوں نے بتایا کہ ہماری پرورش جو قوت کر رہی ہے وہی پالنے والی قوت آسمانوں اور زمین (اور ان دونوں میں رہنے والی ہستیوں کی) بھی پروردگار ہے وحدانی ربوبیت کے اس جلوے نے ان کے لئے آبادی اور جنگل دونوں کو ایک کر دیا۔ ان کی قوم جو ایمان اور ایمان سے پیدا ہونے والی بصیرت سے محروم تھی ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لامحدود کائنات کے اس نظام کی ربوبیت و پروردگاری کے لئے صرف ایک ہی "رب" کیسے کافی ہو سکتا ہے اسی لئے ایک خالق کے وجود کو ربوبیت اور پروردگاری کے لئے ناکافی ٹھہراتے ہوئے انہوں نے دوسری ہستیوں کے ساتھ وہی رشتہ قائم کر لیا تھا جو رشتہ بندوں اور ان کے معبودوں میں ہوتا ہے یعنی ان سے مدد حاصل کرنے کے لئے ان کی عبادت کرتے تھے ان سے دعائیں مانگتے تھے ان کی پوجا پاٹ کرتے تھے نوجوانوں کی یہ نئی ایمانی باطنی روشنی میں خالقِ عالم کی پروردگاری تو پا رہی تھی کہ کافی ہے اور قطعاً کافی ہے اور ان کی قوم اسی ربوبیت اور پروردگاری کے لئے مزید قوتوں کا اضافہ کر رہی تھی گویا علمِ مناظرہ کی اصطلاح میں نوجوانوں کی حیثیت منکر کی تھی اور مدعی ہونے کا مقام ان کی قوم کو حاصل تھا مسلم بات ہے کہ بارِ ثبوت ہمیشہ مدعی کے سر ہوتا ہے منکر کے لئے انکار کافی ہے۔ اسی لئے نوجوانوں نے جیسا قرآن نے نقل کیا ہے کہ وہ بولے

"هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ۔

"یہ ہماری قوم ہے (خالقِ عالم) کے سوا دوسروں کو اپنا معبود ٹھہرا لیا ہے کیوں نہیں لاتی (یہ) اپنے اس دعوی پر کوئی ایسی کھلی ہوئی دلیل جو عقل پر چھا جائے"۔ (الکہف)

"دلیل" "جو عقل پر چھا جائے" یہی سلطان کے لفظ کا گویا ترجمہ ہے سلطان کے ساتھ

انہوں نے بیــــن" کے لفظ کا اضافہ کیا" کھلی ہوئی" ہے بظاہر ان کا مطلب یہ تھا کہ جھوٹے سچے قصے پرانی روایتیں زبانی وساوس کی پشت پناہی میں مشرکانہ اعمال وافعال کو جاری رکھنا' یہ دوسری بات ہے کوئی ان کو "دلیل" یا "سلطان" ٹھہرا لے تو یہ اس کی ذاتی اصطلاح ہو گی لیکن ایک کھلی دلیل جو اپنے وزن سے عقل کو اتنا مغلوب کر دے اور دبا دے کہ دعویٰ کا انکار اس کے لئے نا ممکن ہو جائے' مشرکین کا طبقہ اپنے اعمال وافعال کی جو توجیہ میں پیش نہیں کر سکتا' کیونکہ اس قسم کی دلیل جو صحیح معنی میں "سلطان بین" ہو' اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا ایسے مقدمات سے وہ دلیل مرتب ہوئی ہو جن کی بنیاد مشاہدات ومحسوسات پر قائم ہو۔ ظاہر ہے کہ "ربوبیت" یا پروردگاری میں خالق عالم کے سوا کوئی دوسری قوت بھی شریک ہے' اس کی تائید میں مشاہدات ومحسوسات سے کیا مدد مل سکتی ہے؟' دوسری صورت یہ ہے کہ خالق عالم نے وحی کے ذریعے جو باتیں منکشف فرمائی ہیں جن کا اصطلاحی نام "منصوصات" ان پر دلیل مبنی ہو تو مشرک قومیں وحی والہام کی معلومات سے بھی یقیناً فائدہ حاصل نہیں کر سکتیں' کیونکہ جو ذخیرہ وحی والہام کی معلومات کا دنیا میں موجود ہے اس میں کوئی تائیدی شہادت مشرکانہ کاروبار کے لئے میسر نہیں آ سکتی۔ آگے ان ہی نوجوانوں کی تقریر کا یہ فقرہ قرآن نے جو نقل کیا ہے یعنی:

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا۝

"اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے"

بظاہر اس فقرے سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مشرک اگر اس کا دعویٰ کرے کہ اللہ ہی نے اس کو مشرکانہ کاروبار کا حکم دیا ہے' یہ خدا پر افترا ہو گا' اور خدا پر جھوٹ باندھنے والوں سے زیادہ بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے' خلاصہ یہ کہ خالق عالم کی پروردگاری کو ناکافی ٹھہراتے ہوئے دوسری قوتوں کو الٰہ بنانے کی ضرورت کا دعویٰ جو مشرکین کرتے ہیں۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں نہ کوئی عقلی دلیل ہی وہ پیش کر سکتے ہیں اور نہ وحی والہام کی معلومات سے اس سلسلہ میں ان کو کوئی مدد مل سکتی ہے۔

بہرحال اپنے رب پر ایمان لانے کا اجر پہلے تو ان کو یہ ملا کہ ہدایت کی باطنی روشنی ان کی بڑھا دی گئی تا آنکہ اس مقام تک پہنچ گئے جس پر پہنچنے والا "زانو دل" یعنی عقل یا دماغ یا دل کی

بے شمار چیزوں سے شناسائی ہو کر تندرست ہی جانا ہے پھر سکون و طمانیت کی اس کیفیت نے ان
میں جرات و ہمت پیدا کی کہ وہ کھڑے ہو گئے اس اقدام کے لئے کمر بستہ ہو گئے۔ ان نوجوانوں
میں اور ان کی قوم میں کش مکش کی جو نوبت آئی اس کو رویداد کے الفاظ میں ظاہر کرنے کے بجائے ان
نے یوں بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا:

وَإِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَأْوُوا إِلَى الْكَهْفِ يَنشُرْ لَكُمْ رَبُّكُم
مِّن رَّحْمَتِهِ وَيُهَيِّئْ لَكُم مِّنْ أَمْرِكُم مِّرْفَقًا (الکہف)

"اور جب تم نے (اے نوجوانو) کنارہ کشی کر لی ہے ان سے (یعنی اپنی قوم سے) اور
ان چیزوں سے جنہیں اللہ (خالق عالم) کے سوا وہ پوجتے ہیں تو آؤ پناہ لو کہف
(کھوہ) میں، پھیلا دے گا تمہارے لئے تمہارا پروردگار اپنی رحمت کو اور مہیا کرے گا
تمہارے معاملہ میں سہولتیں۔"

جس سے معلوم ہوا کہ یہ پوری قوم جن میں ان کے اعزہ و رشتہ دار بھی ہوں گے وہ بھی
ہوں گے جن سے دنیوی ضرورتوں کے سلسلے میں ان کو امداد ملتی، دوست بھی ہوں گے احباب
بھی ہوں گے مگر ایمان کی بدولت ہی کا اثر ہے کہ خدا کی راہ میں جد و جہد کی شکل میں اس کے سوا اپنی تمام
ضرورتوں اور دلچسپیوں کے ساز و سامان کو ٹھکرا کر اٹھ کھڑے ہوتے ان کو بھی چھوڑا اور جن
مظاہر و معبودوں کے ساتھ ان کی قوم وابستہ بھی ہوتی تھی ان سے بھی قطعی بے تعلق ہو گئے اب ان
میں اس کی صلاحیت بھی پیدا ہو گئی کہ آبادی کو چھوڑ کر پہاڑ کے کھوہ میں بھی اپنے پالنے والے
رب کی پروردگاری کا تماشا دیکھیں۔ ان کی اسی صلاحیت کو دیکھ کر آپ نے دوسرے کے ساتھ
(الکہف) کھوہ کی تنگ و تاریک کوٹھڑی کی اور کتنی قوت کی طاقت کے ساتھ بیٹھیں گی بغیر کسی جھجک اور
تذبذب کے باہم ایک دوسرے کو یقین دلا رہے تھے کہ آبادیوں میں پالنے والے رب کی
پروردگاری اور اس کی مہربانیوں کا تجربہ وہ کر چکے ہیں، اب وہاں بھی تجربہ کریں گے جہاں عام اسباب
کے ظہور کا تصور بھی انسانی عقل ان کا تصور بھی نہیں کر سکتی گویا وہ کہہ رہے تھے جہاں کچھ نظر
نہیں آ رہا ہے وہیں سب کچھ ہمیں میسر آ سکتا ہے۔

قصے کی اجمالی تعبیر میں قرآن کی وجہ کا تذکرہ کیا گیا تھا لیکن یہاں ان کے ایمان کے بعد اس

وقت بیان کیا گیا ہے کہ خود کہف کے ساتھ [illegible] اور نسبت پیدا ہو گئی تھی جس کی اس کہف سے
آفتاب کی ابتدا تھا لیکن چونکہ غار کے ساتھ نسبت اور کسی اس نسبت کو قرآن نے ظاہر کیا ہے اس
سے عرفی لحاظ سے بھی رو سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ تعلق پیدا ہونے کے بعد آفتاب اور اس کی
دھوپ اس کہف سے کترا جاتی تھی۔ میرا خیال یہی ہے کہ جس وقت آفتاب طلوع ہوتا تھا ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ کہف کے دہانے پر اس کی شعاعیں پڑ کر گزر جاتی تھیں حاصل یہ ہے کہ دیر
تک دھوپ ان کے کہف میں نہیں ٹھہرتی تھی بلکہ ذات کی تاریکی کی وجہ سے رطوبت اور حرارت اور
ان سے پیدا ہونے والے نتائج کو صاف کر کے گزر جاتی تھی۔ چاہیں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ
طلوع کے وقت کہف والوں کے لئے اور کہف والوں کے لئے آفتاب کی بالائی بخشش شعاعوں سے
استفادہ کا موقع فراہم کیا گیا تھا برعکس اس کے جس وقت آفتاب غروب ہونے لگتا تھا تو قرآن
نے کہف کے ساتھ نہیں بلکہ اصحاب کے متعلق یہ اطلاع دی ہے کہ آفتاب ان کو کاٹ جاتا تھا۔
یہاں کہف کو صرف نہیں ہے جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ کہف والے غروب کے وقت کی دھوپ
سے کچھ محفوظ رہتے تھے جس کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ غروب سے پہلے دن بھر کی دھوپ سے
گرمائی رہتی ہے اسی لئے شام کی دھوپ نامرغوب ہی ہوتی ہے نہ مفید۔ بہرحال ایک نکتہ یہاں بھی
پیش نظر رکھنا چاہئے کہ غروب کے وقت سے بے تعلقی کو قرآن نے کہف کی طرف نہیں بلکہ براہ
راست اصحاب کہف کی طرف منسوب کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود کہف تک غروب کے
وقت کچھ نہ کچھ دھوپ پہنچتی تھی لیکن جو (یا کرے) جس اصحاب کہف تھے وہاں تک اس کی
رسائی نہ تھی اور اسی سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ کہف دو رخا تھا ایک رخ اس کا ٹھیک سمت جنوب
مائل بمشرق تھا اور دوسرا سمت شمال مائل بمغرب رخ تھا۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو شمال و جنوب
کے ساتھ غروب بطلوع کے وقت آفتاب کے ساتھ نسبت اور تعلق کو بیان کرنے کی ضرورت نہ
کیا تھی؟ بلکہ اسی بنیاد پر میں تو یہی خیال کرتا ہوں کہ ہوا کی آمد و رفت کا راستہ کہف میں کھلا ہوا
تھا۔ کہ یوں ہوا اور آفتابی شعاعوں اور ہوائی لہروں سے کہف کی صفائی کا کام قدرت لے رہی
تھی۔

خدا ہی جانتا ہے کہ ان غریب نوجوانوں کے گھر شہر کے کس حصہ میں تھے اور حکومت و راحت

ایمانی معاوضوں کے کرشمے:

یہاں تک تو ایمان کے اجر و ثمر کے ایسے مظاہر ہیں اور اللہ کی ایسی آیتیں اور نشانیاں تھیں جن سے بے ایمانی کے مجرموں کو اللہ کے پانے کی توفیق تو نہیں میسر آئی لیکن بذات خود ان نشانیوں اور آیات کو دیکھنے کا مخاطب ان کو بنایا جا سکتا ہے کیونکہ یہ ایسی باتیں تھیں جن کی توجیہ بحث و اتفاق سے بھی کرنے والے چاہیں تو اپنی ہٹ دھرمی سے کر سکتے ہیں کہ ان نوجوانوں کو اس قسم کی سوجھ بوجھ اتفاقاً آ گئی لیکن ان کے بعد ایمانی معاوضوں کے جن کرشموں کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے ان کی حالت تو یہ ہے کہ مومن ہوئے بغیر شاید ان کے ماننے کو بھی کوئی مشکل ہی سے آمادہ ہو سکتا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ کہف والے کہف میں جس وقت داخل ہوئے تو جیسا قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے اپنے ساتھ ورق (چاندی) کی کوئی مقدار بھی لے گئے تھے غالباً یہ چاندی سکے کی شکل میں تھی اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن چیزوں کو نئی زندگی میں ساتھ رکھنے کا امکان تھا ان کے رکھنے اور کہف میں ساتھ لے جانے سے غالباً احتراز اور پرہیز کا طریقہ انہوں نے اختیار نہیں کیا تھا اور بالکل ممکن ہے کہ بچھانے اور اوڑھنے کا تھوڑا بہت سامان بھی ان کے ساتھ رہا ہو اور جیسے کہ عرض کر چکا ہوں قرآنی اشارات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رشد اور فکری و نظری قوت کو زندہ رکھنے کے لیے اگر ان کے پاس کچھ مخطوطات اور کتابیں رہے بھی ہوں تو الرقیم کی جو تفسیر ابن عباسؓ سے منقول ہے اس سے اس کی تائید ہی ہوتی ہے۔

عام طور پر اس قصہ کو لوگ جس شکل میں بیان کرتے ہیں اس کی بنیاد پر تو خواہ کچھ ہی کہا جائے لیکن جہاں تک قرآنی آیات کا تعلق ہے ان کی روشنی میں یہ دعویٰ آسانی کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا کہ کہف میں داخل ہونے کے ساتھ ہی وہ سو گئے بلکہ میرا خیال ہے کہ اپنے ساتھ جو کچھ وہ لائے تھے جس میں کھانے پینے کی خشک اور تر چیزوں کا سب سے پہلے ہونا چاہیے تو جب تک ممکن ہوا اس سے مدد لی اس طویل گہری نیند کی ان کو ضرورت ہی نہ تھی جس کا ذکر بعد کو خود قرآن نے کیا ہے۔

بہر حال میرا خیال یہی ہے کہ کہف میں داخل ہونے کے ساتھ ہی کوئی ضروری نہیں کہ ان کو سویا ہوا تسلیم کر لیا جائے' بلکہ ظاہر حالات کا تقاضا یہی ہے کہ جب تک ساتھ لائی ہوئی چیزوں سے مدد ملتی رہی اس وقت تک ان کے ساتھ کوئی غیر معمولی صورت پیش نہیں آئی اور اس کے پیش آنے کی ضرورت بھی نہ تھی' ہاں جب لایا ہوا ذخیرہ ختم ہو گیا تو اس نازک وقت میں یہ اہم سوال تھا کہ خورد و نوش کی چیزیں کہاں سے مہیا ہوں گی؟ ایک صورت تو اس کی یہ تھی جیسا کہ بیدار ہونے کے بعد انہوں نے عمل بھی کیا کہ چھپ چھپا کر شہر ہی سے کھانے پینے کا سامان منگوالیں' لیکن جن حالات میں دشمنوں کے پنجوں سے بچ کر نکل جانے میں وہ کامیاب ہوئے تھے شاید ان حالات میں شہر کی طرف رخ کرنا ان کے لئے مناسب نہ تھا پس ان ہی نازک ترین گھڑیوں میں اب ان کا ایمان ان کے آگے اجر اور سعادت کی ایک ایسی صورت کو پیش کرتا ہے جس کے سننے کی تاب بھی ایمان سے محروم عقل نہیں لا سکتی قرآن کی آیت:

"وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ۔"

''اور تم خیال کرو گے کہ وہ بیدار ہیں' حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں۔''

میں اطلاع دی گئی ہے کہ ان پر نیند طاری ہوئی' عجیب و غریب نیند' ایک طرف تو اس کی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ لوگ جاگ رہے ہیں' اور دوسری طرف اسی نیند کا ایک پہلو یہ بھی قرآن ہی نے اس کے بعد بیان کیا ہے:

وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ۔

''اور ہم ان کو الٹتے پلٹتے رہے' دائیں اور بائیں پہلو پر۔''

جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ایسی گہری نیند ان پر طاری ہوئی تھی کہ نیند میں بھی تھوڑا بہت احساس یا اختیار کروٹ بدلنے کا آدمی میں جو باقی رہتا ہے اس اور اختیار سے بھی وہ قطعی طور پر خالی ہو چکے تھے اور کروٹ بدلنے کا انتظام براہ راست قدرت کی طرف سے کیا گیا۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس گہری نیند کی مدت کتنی تھی۔ قرآن میں قصہ کو ختم کرتے ہوئے خبر دی گئی ہے کہ تین سو نو سال تک اس کہف میں ان کا قیام رہا' لیکن ظاہر ہے کہ یہ ان کے قیام کی مدت ہے نہ کہ نیند کی۔ بہر حال اتنی بات تو ضرور معلوم ہوتی ہے کہ ان پر گہری نیند طاری ہوئی اور

اسی نیند کی بدولت جب تک وہ سوتے رہے کھانے پینے کی ضرورت سے بے نیاز رہے۔ البتہ ایک ایسی جگہ جہاں وہ سوئے تھے نیند کی حالت میں طرح طرح کے خطرات کا اندیشہ ہو سکتا تھا۔ موذی حشرات الارض یا درندے یا چور وغیرہ کسی چیزوں کا اندیشہ تھا لہٰذا ان ہی خطرات سے حفاظت کے لئے یہ کیا گیا کہ دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ جاگ رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ جیسا کہ قرآن ہی میں ہے:

وَكَلْبُهُم بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ۔

"کتا ان کا دونوں ہاتھوں کو پھیلائے در پر (کہف کے) پڑا ہوا تھا۔"

اور یہ بھی کتے کے جاگنے کی ہیئت ہے دیکھنے والوں کو گویا معلوم ہوتا تھا کہ کتا بھی بیٹھا ہوا ہے۔ ان سب کے سوا ان کے ایمان کا اثر حسن ایک یہ بھی تھا کہ جس کی قرآن نے تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے کہ:

لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا۔

"اگر تو ان کی طرف جھانکے تو پیٹھ پھیر کر بھاگے اور بھر جائے تو رعب سے ان کو دیکھ کر اسی 'ایمانی اثر' کی روحانی تعبیر ہے۔

ہیبت حق است ایں از خلق نیست ہیبت آں مرد صاحب دلق نیست
ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزید ترسد از وے جن و انس و ہر کہ دید ❶

---

❶ کوئی سنا سنایا افسانہ نہیں ہے بچشم دید مشاہدات میں دیکھا گیا ہے کہ اللہ کے ان محبوب بندوں کو جن کا قلب اپنے رب کے ساتھ، یہ وابستگی میں استغراق کی کیفیت میں ڈوبا ہوا ہے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اور دنیا کے حالات سے وہ قطعاً بے خبر اور جاہل ہیں کہہ سکتے ہیں کہ تماشا بن کر رہ گئے ہیں لیکن ان سے گفتگو جب کی گئی تو دین ہی نہیں دنیا کے معاملات میں بھی ان سے کوئی مشورہ اگر لیا گیا تو اس وقت ایسی ایسی باتیں ان سے کی گئی ہیں جن پر ان لوگوں کو حیرت ہوئی ہے جو جیتے جاگتے دنیا اور دنیا کے قصوں میں الجھے رہتے ہیں۔ میں نے تو جب ان لوگوں کو دیکھا اور ان سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا تو تحسبھم ایقاظا وھم رقود (تم خیال کرتے ہو کہ وہ جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں) کا مصداق ان کو پایا ان کی باتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے باخبر گویا جاگ رہے ہیں لیکن واقعہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا اور دنیا کے جھگڑوں کے لحاظ سے وہ رقود (سوئے ہوئے) ہوتے ہیں۔ ارباب بزرگوں کے آستانوں پر اگرچہ لوگ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

واقعہ یہ ہے کہ یہ ایمانیوں کی اصل ایمانی صلاحیتوں کے ان تذکروں کو برداشت کرے یا نہ کرے مگر اس وقت تک کہف والوں کے ایمانی اجر کے جن قوالب ومظاہر کو قرآن نے بیان کیا ہے کسی نہ کسی رنگ میں آج بھی چاہا جائے تو ایمانیوں کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کا مشاہدہ اور تجربہ کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ روز بروز اب ان کی تعداد گھٹ رہی ہے تاہم اب بھی دنیا ان قدسی نفوس سے قطعی طور پر خالی نہیں ہوئی ہے۔ ڈھونڈنے والے چاہیں تو اب بھی دنیا کے دور دراز گوشوں میں ان کو پا سکتے ہیں۔

البتہ اس کے بعد قرآن نے وکذلک بعثنٰھم (اور جس طرح اٹھایا ہم نے ان کو) کے تمہیدی الفاظ کے ساتھ کہف کے ایمانی اجر کے جس رخ کو بے نقاب کیا ہے اور اس تمہید کے بعد جو باتیں بیان کی گئی ہیں۔ عامی آدمی کے لئے تو شاید اس کا سمجھنا بھی دشوار ہو۔

مطلب یہ ہے کہ کہف میں کہف والوں کے قیام کی مدت جو تین صدیوں سے بھی متجاوز ہے اولاً عام حالات کے لحاظ سے بجائے خود بھی ایک غیر معمولی حادثہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عام طور پر شخصی حالات یا زندگی کی اتنی طوالت کہ صدیوں سے تجاوز ہو جائے چنداں حیرت انگیز بات نہیں ہے آخر اسی لئے بلکہ شیاطین جیسی زندہ ہستیوں کے متعلق بغیر کسی شک اور تذبذب

(گزشتہ سے پیوستہ) کہ تو میں نے نہیں پایا لیکن بسا اوقات یہ دیکھا ہے کہ کوئی پیار تیار ہونا چاہیں تو مشہور حدیث کی روایت "کلب من کلاب النار" (دنیا کے کتوں میں کوئی کتا) آپ قرار دے سکتے ہیں اور کسی نہ کسی وجہ سے ان بزرگوں کے ساتھ عقیدت واخلاص کا ایسا تعلق پیدا کر لیتا ہے کہ بسا اوقات اسی وجہ سے وہ معتقد کی عقیدت مندی ان بزرگوں کے مخالفوں کے مقابلہ میں مدافعت کا کام کرتی رہتی ہے خود تو ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا لیکن یہ دیکھ کر فلاں امیر یا حکمران یا حاکم ان کا معتقد ہے مخالفوں کو اب گستاخی کی بھی ہمت نہیں ہوتی اور اس کا تجربہ تو جس وقت جی چاہے آپ کر سکتے ہیں کہ دنیاوی جاہ وحشمت، اقتدار و اختیار رکھنے والے جب کسی مرد صاف القلب ایمانی شخصیت کے سامنے آتے ہیں تو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ان کے بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ بات کرنا چاہتے ہیں لیکن نہیں کر سکتے دل ان کا رعب سے معمور ہو جاتا ہے اس کے سامنے بیٹھنا چاہتے ہیں لیکن نہیں بیٹھ سکتے کھڑے کھڑے کانپ رہے ہیں۔ میں بالعموم شاعری سے کام نہیں لے رہا۔ بحمد اللہ ان گرامی پایہ ہستیوں کی خدمت میں حاضری کی سعادت میسر آئی اور سچ پوچھئے تو ان ہی بزرگوں کو دیکھ کر سورۂ کہف کی ان آیتوں کا مطلب سمجھ میں آتا ہے۔ مؤمن کی حفاظت اس کے ایمانی اجر سے کیسے ہوتی ہے اس کے تجربہ کا موقع ان ہی بزرگوں میں ملتا رہا ہے۔

کے یہ یقین مانا جاتا کہ پیدا ہونے کے بعد تاریخ کے نامعلوم عہد سے اس وقت تک اپنی شخصی حیات کے ساتھ وہ زندہ ہیں اور قضائے الٰہی جو چاہے ہوگا آئندہ بھی ان کی زندگی کا تسلسل کب تک باقی رہے گا جبکہ ان نادیدہ ہستیوں کے سوا دنیا کی بعض چیزوں میں گدھ وغیرہ جانوروں پر زندگی رکھنے والوں کے متعلق طوالت عمر کا دعویٰ کیا لوگ نہیں کرتے؟ تاہم انسانی قالب میں انفرادی، شخصی زندگی کی اتنی طوالت روز مرہ کے عام مشاہدات کے خلاف ضرور ہے۔ جبرائیل، میکائیل، اسرافیل علیہم السلام جیسے فرشتوں کے متعلق یہ مان کر کہ جب سے پیدا ہوئے ہیں زندہ ہیں اور آئندہ بھی مدتوں زندہ رہیں گے۔ اگرچہ ہمیں تعجب نہیں ہوتا مگر ان کے مقابلہ میں نوح یا خضر علیہما السلام کی طویل زندگی کا مسئلہ اسی لئے موجب حیرت بنا ہوا ہے کہ وہ انسان تھے اور نوح و خضر علیہما السلام کی طوالت عمر کی تو ایک توجیہ بھی ہو سکتی ہے۔ ❶ لیکن کہف کے ان نوجوانوں کے متعلق تو اس کی بھی گنجائش نہیں اور قصہ اسی پر ختم نہیں ہوا بلکہ بیدار ہونے کے بعد اپنے سونے کی مدت ان کو ایک دن یا دن کے کچھ حصے سے زیادہ محسوس نہیں ہوئی جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں صحیح طور پر قرآن سے یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ ان کے سونے کی مدت کتنی تھی جو تم قرآن

❶ نوح علیہ السلام کا تعلق ظاہر ہے کہ نسل انسانی کے اس قرن سے ہے جب زمین کو آباد کرنے کے لئے یہ نسل اس کرہ پر پھیلائی گئی تھی۔ حیوانات نادرہ کے ماہرین کہتے ہیں کہ اس زمین پر ایک ایسا وقت بھی گزر چکا ہے جب چھپکلی گرگٹ وغیرہ جیسے جانوروں کا قد جو اس زمانے میں بالشت ڈیڑھ بالشت سے زیادہ بڑا نہیں ہوتا ہے ان کی باقیات کے زمین سے نیچے برف سے تازہ ان میں نکلے ہیں جن سے اندازہ کیا گیا ہے کہ ہاتھیوں سے بھی دو چند ہوتا تھا ان جانوروں کا قد جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نشوونما کی قوت تاریخ زمین کی جوں جوں پرانی ہوتی جاتی ہے کم ہوتی جاتی ہے، ابتدائی زمانہ میں یہی قوت کہیں زیادہ تھی ایسی صورت میں اگر انسانی وجود بھی زمین کی اس قوت سے مستفید ہوا ہو تو اس پر تعجب کیوں کیجئے بلکہ آدم کے قد کے متعلق روایتوں میں جس درازی کا ذکر کیا گیا ہے زمین کے حالات کے لحاظ سے مناسب ہی پایا جاتا ہے۔ باقی مسیح علیہ السلام کی طوالت زندگی کا مسئلہ سو اس باب میں اگرچہ یہ نہیں مانتے ہو کہ حضرت والا کے جسد وجود میں انسانی حصہ صرف والدہ محترمہ کی طرف سے شریک تھا ورنہ جیسا کہ معلوم ہے متمثل ہو کر فرشتے نے آپ کی والدہ کے بطن مبارک میں آپ کو ڈال دیا تھا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا پیدا ہونے کے ساتھ تکلم کرنا، مردوں کو زندہ کرنا، بے جان پرندوں کو جاندار بنا کر اڑا دینا، پیدائشی اعضا جن سے زندگی کے آثار غائب ہو گئے تھے ان میں پھر زندگی کے آثار پیدا کر دینا یعنی اندھوں کو بینا کر دینا کوڑھی کو چنگا کر دینا یہ سارے قصے ان کی ملکوتی نسبت ہی کے نتائج تھے اور زندگی کی طوالت بھی اسی کا اثر ہے۔ والقصۃ بطولہا۔

سازی۔"

ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ بھوک کا تقاضا بھی چنداں سخت تھا ورنہ ازکیٰ طعاما (صاف ستھرے لذیذ) کھانے کی تلاش کا حکم وہ نہ دیتے اور یہ بھی ان کے ایمان کے کرشموں میں سے ایک حیرت کرشمہ تھا۔

کذلک کے لفظ سے ان کے ایمانی نتائج کو قرآن نے جو الگ کردیا ہے غالباً ان کی اہمیت ہی کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی ایمانی اجر ہونے میں یوں تو سب مساوی ہیں لیکن غیر معمولی ہونے کی وجہ سے ان کی نوعیت گزشتہ آثار سے چونکہ مختلف تھی اس لئے ان کو پہلی فہرست سے قرآن نے جدا کردیا۔

اسی کے ساتھ ذیلی طور پر ایک سبق تو اس سے یہ ملتا ہے جیسا کہ امام رازیؒ نے بھی لکھا ہے۔

وھذہ الایۃ تدل علی ان السعی فی امساک الزاد امر مھم مشروع وانہ لا یبطل التوکل۔

"یہ آیت بتاتی ہے کہ زادراہ کا ساتھ رکھنا یہ شریعت کا ایک اہم مسئلہ ہے اور توکل پر اس سے زد نہیں پڑتی۔"

نیز "ازکیٰ طعاما" کی تفسیر اگر یہ کی جائے، امام ہی نے دوسرے اقوال ● کے ساتھ اس کا تذکرہ بھی بایں الفاظ کیا ہے۔

ایھا اطیب والذ (ص ۹۹ جلد ۵)

"یعنی غرض ان کی یہ تھی کہ کھانوں میں جو صاف ستھرا اور لذیذ کھانا ہو اس کو حاصل کریں"

تو اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ طیبات من الرزق یا ایسی غذا جو آدمی کے ذائقے کے مناسب اور لذت بخش ہو خواہ مخواہ اس سے نفرت یا پرہیز پیدا کرنے کی مشق دینی راہ کے سلوک میں قطعاً

● رازی کی تفسیر میں یہ کہا کہ غیر ذبیحہ یا بتوں پر چڑھائی ہوئی چیزوں سے بچنے کا مشورہ دیا ہو گئے یہ مشورہ اصحاب کہف کی جماعت کے کسی رکن کو ظاہر دینے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ ایسی باتیں تو ہر معمولی مومن آدمی بھی جانتا ہے۔

غیر ضروری ہے۔

اور اسی کے بعد آگے قرآن کے الفاظ یہ ہیں:

وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ أَحَدًا ○ إِنَّهُمْ إِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوكُمْ أَوْ يُعِيدُوكُمْ فِي مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوا إِذًا أَبَدًا (الکہف)

"اور چاہئے کہ کھانا لانے جو شہر جائے وہ نرمی سے کام لے اور اپنے متعلق کسی کو پتہ چلنے نہ دے (کیونکہ) اگر وہ تم سے واقف ہو جائیں گے تو سنگسار کر دیں گے تمہیں یا واپس پلٹا لیں گے اپنے کیش و ملت کی طرف جس کے بعد تم کبھی کامیاب نہ ہو گے"

اور یہ وہی بات ہے جس کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں یعنی اپنی قوم اور اپنے وطن کو چھوڑ کر کھفی زندگی بسر کرنے کے لئے نوجوانوں کی یہ ٹولی شہر سے جس حال میں نکلی تھی قرآن نے ان ہی کی زبانی اس حال کے متعلق ان کے اعترافی الفاظ کو یہیں نقل کیا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی قوم سے ان کی مخالفانہ کشمکش شدت کی اس آخری حد تک پہنچ چکی تھی کہ اپنی جان سے ہاتھ دھو لیں یا جس دین کے لئے وہ سب کچھ برداشت کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے (العیاذ باللہ) اسی سے دست بردار ہو جائیں اور اسی کا خطرہ کہف میں داخل ہونے کے بعد بھی ان کے دلوں میں باقی رہا باوجود یہ کہ ایمان یقین کے اس درجہ تک قرآنی شہادت کے رو سے ان کی رسائی ہو چکی تھی جس کا نام ربط ہے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ بجائے مقابلہ کے اس شخص کے متعلق جو کھانا لانے کے لئے شہر بھیجا جا رہا تھا یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ لطف و نرمی کی راہ اختیار کرے اور اسی طریقہ سے بازار میں داخل ہو کہ دوسروں کو پتہ نہ چلے کہ وہ ان کی جماعت کا آدمی ہے۔

ممکن ہے کہ کائنات کے حوادث و واقعات اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج کو خالق کائنات کی مرضی کی تاثیری کارفرمائیوں سے بغیر سوچے کے جو دیکھتے ہیں ان کو کہف والوں کی اس "ذہنیت" کے پیچھے بزدلی اور اخلاقی کمزوری کے عناصر پوشیدہ نظر آتے ہوں اور ان کے نزدیک اخلاقی قوت کے مظاہرے ہی کی یہی واحد شکل ہو کہ بڑی سے بڑی قوت کے ساتھ انتہائی خطرناک حالات میں بھی نتیجہ سے قطعاً بے پرواہ ہو کر آدمی ٹکرا جائے مگر میں نے پہلے بھی نقل کیا ہے اور قرآن نے اصحاب کہف کی زبانی اس موقع پر ان کی طرف جس طرز عمل کو منسوب

گیا ہے اس سے بھی یہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ خواہ یہ طریقہ کار لا حاصل ہے یا نتیجہ خیز ہو یا نہ ہو مگر
فلاح و بہبود کے توقعات و امکانات کے دائرے کو تنگ ضرور کر دیتا ہے۔ آخر خود سوچئے کہ ایسی
صورت میں گرانے والے اگر (عیاذاً باللہ) ارتداد کے اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے تو فلاح و
کامیابی کا دروازہ کیا ہمیشہ کے لئے اپنے اوپر بند نہ کر لیتے اور بجائے ارتداد کے اگر رجم
(سنگسار) ہونے کی سزا قبول کر کے اپنے آپ کو ختم کرا دیتے تو گو ذاتی طور پر شہادت ہی کا درجہ
ان لوگوں نے حاصل ہو جاتا مگر دوسروں کے لئے فلاح و بہبود کے جو امکانات ان کے وجود سے
تھے یقیناً اس کی راہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتی۔

ان کے بیان کے الفاظ

وَلَنْ تُفْلِحُوْا اِذًا اَبَدًا۔

''اور نہ کامیاب ہو گے تم لوگ اس صورت میں پھر کبھی''

سے میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ فلاح سے محرومی کے اس خطرے کا تعلق صرف 'ارتداد' ہی سے
نہیں بلکہ رجم اور سنگسار ہونے کے اندیشے سے بھی بظاہر معلوم ہوتا ہے اور اس صورت میں بھی متعدی فلاح
سے شہید ہو کر اپنے وجود کے منافع سے لوگوں کو ضرور محروم کر دیتے ہیں۔

ایک انقلابی تحریک اور کہف والوں کا برآمد ہونا

بہر حال خواہ عقل کے مشورے پر چلنے والے ہوں یا درحقیقت عقل کی پیغمبری کو قبول
کرتے وقت ایمان و اسلام کا مجازی نزول عقل پر نہ بنا کر زندگی کے پروگرام بنانے کے عادی
ہوں اس قسم کی ذہنیت رکھنے والوں کو اختیار ہے جس طرح چاہیں سوچیں اور جو جی چاہے قائم
کریں جس چیز کا چاہیں اخلاقی کمزوری یا جبن و بزدلی وغیرہ نام رکھ دیں لیکن دیکھئے خاص ایمان
کے تحت جو جی رہے تھے ان کو تجربہ کرایا جا رہا ہے کہ ان ہی کا ایک حال تو یہ تھا کہ ان کی قوم ان
کے خون کی پیاسی اور ان کے دین کی دشمن بنی ہوئی تھی کہ اچانک ایک نیا انقلاب شروع ہو رہا ہے
وہی شہر جس کے شریروں کے خوف سے کہف میں ان نوجوانوں نے پناہ لی تھی اسی شہر کے رہنے
والوں میں ایک نیا جذبہ ابھر رہا ہے آگے کی آیتوں میں اسی نئی انقلابی تحریک کا قرآن نے ذکر کیا

سب بحثوں کا حاصل یہی ہے کہ دشمنوں کی وہاں آبادی اور وہاں شہر میں دیکھا جا رہا تھا کہ ان کی
مظلومیت اور بے کسی کے عالم میں ان کے شہر سے نوجوانوں کی یہ ٹولی جو نکلی تھی ان ہی کے دو
تو یہ عاشق زار بنے ہوئے ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ اپنے شہر کے باشندوں کے خلاف طرز عمل
پر ندامت کا اظہار کر کے پیچھے رہتے تھے بلکہ ملاقات کی کوئی سبیل نکالتے پھرتے ہیں کہ جن پر ظلم
کیا گیا تھا ورنہ دین کے قبول کرنے کے جرم میں جو پامال ہونے پر جنہیں مجبور کیا گیا تھا ان کی
کوئی یادگار قائم کریں۔ بعض لوگوں کی رائے اپنے مذاق کے مطابق یہ تھی کہ ان کی یاد میں
کوئی عمارت بطور یادگار کے بنائی جائے اور دوسرا طبقہ "عبادت گاہ کی عمارت" کی اس رائے
کے بجائے تجویز کی مخالفت کر کے چاہتا تھا کہ جس خدا کے لئے ان نوجوانوں کو مصائب میں مبتلا ہونا
پڑا تھا اسی خدا کی عبادت کے لئے ان کی یاد میں مسجد بنائی جائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو عقیدہ اور ضمیر
کہف کے ان نوجوانوں کے دشمنوں اور مخالفوں سے چھپا ہوا تھا وہی علاقہ اور شہر اب صرف ان
کے عقیدت مندوں کا بن گیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اچانک محسوس ہو گیا اور حیرت انگیز ہوا کہ جن
دنوں میں یہ انقلابی تبدیلی اس شہر کے اندر برپا تھی اچانک یہ عجیب و غریب واقعہ پیش آیا کہ جن
سے ملاقات کا لوگوں کو شاید گمان بھی نہ تھا کہف سے ان ہی نوجوانوں سے متعلق شہر والوں کو یہ
خبر ملی کہ وہ تو اس وقت تک اسی کہف میں حتیٰ کہ جاگتی حالت میں پائے جا رہے ہیں۔ یہ صورت کیسے
پیش آئی جو قصوں میں تو جو یہ بیان کیا گیا ہے اور مشہور ہے کہ بازار میں سب کھانا لینے کے
لئے کہف سے آدمی آیا اور جو سکہ اس نے نان بائی کے حوالے کیا وہ دقیانوس نامی بادشاہ کے عہد کا
سکہ تھا جو تین سو سال پیشتر اس شہر میں چلا کرتا تھا۔ نان بائی نے اس سکہ کو دیکھ کر پوچھ
گچھ کی لوگوں میں اس کا چرچا پھیلا۔ آخر اس آدمی کو اقرار کرنا پڑا کہ میرا تعلق نوجوانوں کی اس
جماعت سے ہے جو دشمنوں کے خوف سے کہف میں روپوش ہو گئے ہیں اسی ذریعہ سے لوگ کہف
میں ڈھونڈتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں حجرہ میں یہ لوگ بیٹھے ہوئے کھانے کا انتظار کر
رہے تھے۔ ارباب حکایت و قصص کی روایت کو کافی رنگ آمیزیوں کے ساتھ کتابوں میں نقل
کرتے ہیں لیکن قرآن میں ہم ان تفصیلات کو نہیں پاتے اور سچ پوچھئے تو اس قسم کی دور دراز
تفصیلات سے قرآن کا عام دستور ہے کہ وہ تعرض بھی نہیں کرتا وہ صرف ایمانی اجزا کی نقل

شکلوں کو اس موقع پر پیش کرنا چاہتا ہے۔ چونکہ کہف والوں کے ایمانی اجر و معاوضہ کی یہ شکل بھی اپنی جگہ ایک مستقل نوعیت رکھتی تھی۔ اسی لئے "کذلک" کے الفاظ سے شروع کرتے ہوئے گویا یہ بتاتے ہوئے کہ جیسے گزشتہ نتائج میں ایمانی اجر کہف والوں کے سامنے آیا! اسی طرح ایک نیا مظاہرہ ان کے ایمانی اجر کا اس شکل میں بھی ہوا کہ:

اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۭ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓي اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ۔ (الکہف)

"اچانک ان پر (کہف والوں پر) مطلع کر دیا ہم نے تاکہ وہ جان جائیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کی گھڑی آنے والی ہے قطعاً اس میں کوئی شک نہیں ہے (اور کہف والوں پر مطلع ہونے کا قصہ اس وقت پیش آیا) جب دیکھو (شہر والے) باہم جھگڑ رہے تھے ان ہی کہف والوں کے متعلق پس (بعض) بولے کہ بناؤ ان پر کوئی عمارت ان کا رب خوب جانتا تھا ان کو کہا ان لوگوں نے جو ان کے معاملے پر قابو یافتہ تھے کہ ہم بنا کر رہیں گے ان پر مسجد۔"

بہر حال اصحاب کہف پر اعثار یعنی اچانک ان پر واقف ہونے کی صورت جو پیش آئی اس کی تفصیل جو قرآن نے نہیں بیان کی ہے یعنی بجائے عداوت و دشمنی کے اسی شہر کے باشندوں میں کہف والوں کے ساتھ غیر معمولی دلچسپی بلکہ یہ عشق کا انقلابی سانحہ جو پیش آیا اور اسی جذبہ عشق سے سرشار ہو کر لوگ ان کی یادگاری تعمیر کے متعلق مختلف تجویزیں جو پیش کر رہے تھے قرآن نے صرف یہ خبر دی ہے کہ ٹھیک اسی زمانے میں ان سے واقف ہونے کا حادثہ اچانک رونما ہوا۔ اس سلسلہ میں اسی حد تک قرآن نے اپنے بیان کو محدود رکھا ہے کیونکہ وہ تو صرف یہ بتانا چاہتا ہے کہ ایمان مومن کا ساتھ کہاں تک دیتا ہے کن کن حالات میں: بتاتا ہے اور یہ ایمانی اجر کے ظہور کی شکلیں صرف ان ہی منطقی حدود تک محدود نہیں ہوتیں جہاں تک سوچنے والوں کی عقل عام معلومات و مشاہدات کی رہنمائی میں پہنچتی یا پہنچ سکتی ہے۔ الغرض یہ جو دعویٰ قرآن میں کیا گیا ہے یا اہل ایمان کے لئے صلائے عام دیا گیا ہے کہ:

وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا حَسَنًا مَاكِثِينَ فِيهِ أَبَدًا۔

"اور بشارت دے دے ایمان والوں کو جو اچھی باتوں پر عمل کرتے ہیں کہ یقیناً ان کے لئے اچھا اجر و معاوضہ ہے جس میں وہ رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔"

اسی دعوتی یا اس حالت کے عام کرنے کی تجربات کی یہ مثالیں تھیں جو مختلف زمانوں میں کہف کے ان مومن نوجوانوں کے سامنے مسلسل پیش آتی چلی گئی ہیں اتنی دراز مدت جو کہف میں ان پر گزری چاہیے تو یہ تھا کہ دنیا ان کو بھول جاتی ہے اور نسلوں سے لوگوں کے دل بدل جاتے۔

یادگاروں کے قائم کرنے کا مغربی طریقہ:

مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ بجائے بھلانے کے قدرت ان کی یاد کے نقوش کو ابھارتی ہی چلی گئی۔ نہ صرف دلوں اور دماغوں میں بلکہ جس شہر کے باشندوں کے مظالم سے تنگ آکر بیابان اور غاروں کی زندگی انہوں نے اختیار کی تھی اسی شہر کے رہنے والے ان کے لئے یادگار قائم کرنے کی کوششوں میں مست ہیں۔ ایک جذبہ "عمارت برائے عمارت" والے اصول پر مصر ہے جس کا مذاق عام طور پر آج کل یورپ و امریکہ کے باشندوں پر غالب ہے۔ انہوں نہیں بلکہ بڑا مبالغہ ہمارے یہاں کی بعض عمارتوں میں کروڑہا کروڑ روپے لگا دیئے جاتے ہیں لیکن اسی عمارت میں کسی شہر کے اس غریب کو سر چھپانے کا بھی موقع نہیں ملتا جو موسم سرما کی سرد تاریک راتوں کو کسی فٹ پاتھ پر ٹھٹھر ٹھٹھر کر بسر کرنے پر مجبور ہے۔ اسی کے مقابلے میں دوسرا جذبہ "عمارت برائے عبادت" والی تجویز پیش کر رہا تھا۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی ہی ذہنیت الذی غلبوا علی امرہم کے امر پر غالب تھا شاید اس کا یہ مطلب ہو کہ کہف والوں کے دین کو صحیح معنوں میں قبول کرنے ان کے معاملہ پر غالب آگیا تھا اور اول الذکر "عمارت برائے عمارت" نظریہ والے مگر قوم کے پیرو ہونے کی حیثیت سے ان کی یادگار میں ایک موٹا عجوبہ تعمیر کروانا چاہتے تھے۔ اس تجویز کے ذکر کے ساتھ بطور جملہ معترضہ کے قرآن میں ہے۔

رَبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ۔

"ان کا رب ان کا زیادہ جاننے والا ہے"

کا فقرہ پایا جاتا ہے۔ اس سے "عمارت برائے عبادت" کے نظریہ کی نفی پر شاید ضرب لگانی مقصود ہے جو اس کے جواز میں عموماً پیش کرنے والے پیش کر دیا کرتے ہیں کہ مسجد بنی کی اس قسم کی عمارتوں کو صرف برائے عبادت قرار دینا صحیح نہیں ہے بلکہ اس دنیا سے جو چلے گئے ان کی یاد کو آئندہ نسلوں کے اندر ترو تازہ رکھنے کے لئے عمارت بنائی جاتی ہے۔ اسی پہلو کے کھوکھلے پن کو قرآن ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ بظاہر مطلب یہ ہے کہ اس دنیا سے جو چلے گئے ہیں ان کی یاد یا تو ہم جنس میں ہمیشہ ہی قائم و دائم رہا کرتی ہے اور اس طور پر ترو تازہ رہتی ہے کہ خواہ کتنی ہی مدت اور زمانہ گزر جائے اس کی تازگی میں کسی قسم کا کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں جو عمارتیں تعمیر کی ہوئی ہیں ان کے ذریعے سے فانی ہونے والے عالموں میں ان کی یاد تازہ رہنے کی غیر ضروری تدبیر بجز اہمال اور بے محل کے اور کیا ہو سکتی ہے؟

اور جیسے یہ ایک معترضہ لیکن بہت زیادہ پر معنی فقرہ بیان کے اس حصہ میں پایا جاتا ہے اسی طرح شروع میں "کَذٰلِکَ اَعْثَرْنَا عَلَیْہِمْ" کے بعد۔

لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا۔

"تاکہ وہ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور (قیامت) کی گھڑی میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہے۔"

اس سے بھی ذیلی طور پر قرآن دو باتوں کی طرف خاص متوجہ کرنا چاہتا ہے۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ اصحاب کہف والوں کے سامنے جو باتیں پیش ہوتی رہی ہیں ان سے ایک غرض تو یہی تھی کہ ایمان کے متعلق جس اجر حسن کا وعدہ ہے کہ مومن ایمان کے اس اجر سے ہمیشہ بغیر کسی وقفہ کے مستفید و متمتع ہوتا رہے گا اس کا وعدہ جو کیا گیا ہے یعنی:

وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا۔

"اور بشارت دے دے ایمان والوں کو جو کرتے ہیں اچھے کام کہ یقیناً ان کے لئے اچھا اجر اور معاوضہ ہے رہیں گے اس میں وہ ہمیشہ ہمیش۔"

تا جو خلاصہ ہے ان کو یہ دکھایا گیا کہ خدا کا وعدہ کتنا سچا ہے ایمان کیسی کیسی نازک گھڑیوں میں مومن کی پشت پناہی کرتا چلا گیا ہے"

"اور دوسری بات وہی جو دوسرے فقرے

وَ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَیْبَ فِیْهَا۔

"اور (قیامت) کی گھڑی میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے"

سے سمجھ میں آتی ہے۔ لکھنے والوں نے تو خدا جانے اس کا کیا مطلب لکھ دیا ہے مگر میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اس وعدے کو جو ایمان کے متعلق اس نے فرمایا ہے پورا ہوتا ہوا جو دکھلا دیا ہے تھا اسی کو یہ بتانا مقصود ہے کہ الساعة یعنی قیامت جو ایمان اور بے ایمانی ہی کے قانون کا رزلٹ (آخری انجام) کا دوسرا نام ہے اس میں شک کرنے کی گنجائش ہی اب کیا باقی رہتی ہے۔

نیز بعض لوگ جو خواہ مخواہ عقلی تخمینے میں مبتلا ہو کر ایسی چیزوں کو جن کی نفی ہی عقلی احاطے کے حدود میں داخل ہے اور نہ اثبات۔ ان ہی کے متعلق طرح طرح کی عقلی موشگافیوں سے کام لیتے ہیں مثلاً دعویٰ کرتے پھرتے ہیں کہ ہم جنت و دوزخ قیامت عذاب قبر وغیرہ چیزوں کو عقلی دلائل اور سائنٹفک طریقوں سے ثابت کرنے کے لئے تیار ہیں اور عقل اس قسم کی بد تعلیمات پر تمسخر کرتی ہے بھلا اگر عقل ہی ان باتوں کے دریافت کرنے کے لئے کافی ہوتی تو نبوت و رسالت کا عظیم الشان نظام قدرت کیوں قائم کرتی"

خیر بات طویل ہو جانے کی کھٹک ہے کہ اس قسم کے "غیبی حقائق" کے ثبوت کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ سب سے بڑے صادق اصدق الصادقین خالق تعالیٰ جل مجدہ نے یہ وعدہ کیا ہے کہ مرنے کے بعد مرنے والوں کو پھر ہم دوبارہ جینے کے مثل جیسے کہ پہلی دفعہ ان ہی لوگوں کے اندر جو زندہ تھے زندگی جاری کی گئی تھی اور یہ دوبارہ جینے والے کے سامنے اس کے اعمال کے نتائج آئیں گے یقیناً یہی سب سے بڑی سب سے استوار اور مستحکم دلیل ان غیبی امور کے حقیقی ہونے کی ہو سکتی ہے کہ یہ خدا کا وعدہ ہے۔

پانچ تو تعداد کہف والوں کی ہوتی تھی اور کتے کو چھٹا قرار دیا جاتا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تیسرا قول کن لوگوں کا تھا؟ ہمارے مفسرین نے لکھا ہے کہ تیسری بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ امام رازی نے لکھا کہ گزشتہ دو قولوں کو قرآن نے جب "رجماً بالغیب" یعنی اٹکل پچو قرار دیا ہے تو معلوم ہوا کہ تیسرا قول مقابلتاً واقعہ سے زیادہ قریب ہے۔ پھر واو کے ساتھ تیسرے قول میں کتے کو جو قرآن نے الگ کر کے بیان کیا ہے اس سے امام رازی نے بوجوہ مختلف تیسرے قول کی صحت کو ثابت کرنا چاہا ہے۔

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دو مکاتب خیال میں غلو سے کام لیتے ہوئے لوگوں نے اصحاب کہف کے ساتھ کتے کو بھی اتنی اہمیت دی تھی کہ گویا اس کا وجود اصحاب کہف کے برابر ہو گیا تھا۔ سمجھا یہ جاتا تھا کہ ان ہی میں فانی ہو گیا تھا۔ اسی لئے اصحاب کہف اور کتے کے ذکر میں واو عاطفہ کے فصل کا اضافہ بھی پسند نہیں کرتے تھے اور ہمارے مفسرین کا یہ خیال اگر صحیح ہے کہ تیسرا ہی قول واقعہ کی صحیح ترجمانی کرتا ہے تو واو کے اضافے سے شاید کتے کی حیثیت یا فنائیت کی غلطی کا ازالہ غالباً قرآن کرنا چاہتا ہے۔ ❶ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں قرآن نازل

---

❶ یعنی غلو سے مذہب میں جب کام لیا گیا ہے تو اسی قسم کے بے سروپا شاعرانہ خیالات عقائد میں داخل ہو گئے یہی خیال کہ نیک بنتے ہوئے ترقی کر کے آدمی ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ آدمی نہیں بلکہ خدا بن جاتا ہے۔ فنافی الاصل کا نظریہ جسے کہتے ہیں یا یہ کہ آدمی آدمی نہیں فرشتہ بن جاتا ہے جیسا کہ جینیوں کا عام عقیدہ ہے (اسی لئے قرآنی جنت کی تعبیر جینیوں کے حلقوں میں حیوانی جنت سے کرتے ہیں) مگر ظاہر ہے کہ یہ صرف شاعرانہ مفروضے ہیں قرآن ہمیشہ حق سے پردہ اٹھاتا ہے اس نے خدا بن جانے یا فرشتہ بن جانے کا نظریہ نہیں پیش کیا ہے بلکہ آدمی ہر حال میں آدمی رہتا ہے اسی طرح یہاں بھی شاید یہی بتانا مقصود ہے کہ اصحاب کہف کا کتا خواہ جو کچھ بھی ہو گیا ہو مگر تھا وہ کتا ہی۔ آدمی نہیں بن گیا تھا اور جیسے کتا آدمی نہیں بن جاتا اسی طرح یہ خیال کہ آدمی مرنے کے بعد پاپ کی وجہ سے کتا بن جاتا ہے جیسا کہ تناسخ والے کہتے ہیں سب بے معنی مہملات ہیں۔ مگر اصحاب کہف کے متعلق مسلمانوں میں غیر قوموں کے زیر اثر اسی قسم کے خیالات پھیل گئے تھے۔ سعدی کا مصرعہ سگ اصحاب کہف کے متعلق مشہور ہے کہ "پے نیکاں گرفت مردم شد"

بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ بلعم باعور کے جسم میں سگ اصحاب کہف کی روح جنت میں چلی جائے گی اور بلعم باعور کی روح اس کتے کے قالب میں داخل جہنم ہوگی۔ ہیں تو یہ لغو سی باتیں لیکن سوچئے تو کہف والوں کے ایمان نے ان کی نسبت سے ان کے کتے کو بھی جنت کا کتنا اہم مسئلہ بنا دیا۔

ہو رہا تھا اصحاب کہف کی تعداد کتے کے ساتھ اور کتے کے بغیر دنیا کا یا کم از کم عرب و اطراف عرب کے ممالک کا اہم مسئلہ بنا ہوا تھا۔ قرآن پاک جیسی کتاب کا کام ہے اسی قسم کے بے نتیجہ مسائل سے مسلمانوں کو ہمیشہ الگ رہنے کی تاکید کرتا ہے یہاں بھی یہ فرما کر کہ:

قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ڛ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَاۗءً ظَاهِرًا ۠ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا۔

"کہہ دو کہ میرا رب ان کی تعداد سے زیادہ واقف ہے نہیں جانتے ان کو مگر کم لوگ پس تم نہ جھگڑو ان کے بارے میں مگر سرسری طور پر اور نہ پوچھو ان کے متعلق کسی سے۔"

اپنے اسی اصول کو جس کی تعبیر حدیثوں میں "ترک مالا یعنی" سے کی گئی ہے اسی کا اعادہ کرتے ہوئے قصہ کی جو روح ہے اور عملی زندگی میں مسلمانوں کو چاہئے کہ اس کو دھیان کرتے رہیں اسی کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کرتا ہے۔

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّىْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ۔

"اور ہرگز نہ کہا کرو کہ یہ کام کرنے والے ہیں ہم کل مگر یہ کہ چاہے اللہ"

اہل ایمان کو ملحدانہ طریق سے بچ کر ایمانی راہ اختیار کرنی چاہئے:

جس کا یہ مطلب بھی سمجھ میں آتا ہے کہ خدا کے بغیر عالم، حوادث و واقعات کو سوچنے اور ان کی مدد سے زندگی کا پروگرام بنانے کے جو عادی ہیں ایمان والوں کو شدید تاکید کی گئی ہے کہ اس الحادی بے ایمانہ ذہنیت سے کنارہ کش رہیں۔ اشارہ کیا گیا ہے کہ کہف والوں ہی کی سرگزشت کو دیکھو کن حالات سے ان کی ابتداء ہوئی ان کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے ان کا دین شدید خطرے میں گھر گیا تھا عقل کی راہ سے سوچتے تو خدا جانے کن کن ٹھوکروں سے سابقہ پڑتا لیکن انہوں نے ایمان کی راہ اختیار کی اور جس رب پر ایمان لائے تھے اسی کو ہی پیش نظر رکھتے ہوئے انہوں نے قدم اٹھایا پھر ان کو تجربہ کرا دیا گیا کہ ایمان کی راہ اختیار کرنے والے کو کبھی دھوکا نہیں ہوتا ناموافق سے ناموافق بدترین حالات ایمانی قوت اس سے

۔۔۔ سے اور دوسرا طریقِ فکر و عمل وہ ہے جس کا سبق ہمیں اصحابِ کہف کی قرآنی سرگزشت سے ملتا ہے۔ قرآن نے اسی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے حکم دیا ہے کہ

''ہرگز ہرگز نہ کہا کرو کہ ہم یہ کام کل انجام دیں گے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔''

ہر اقدام میں مومن کی نظر مشیتِ حق پر ہونی چاہئے:

جس کا ماحصل یہ ہوا کہ مومن کو چاہئے کہ اپنے ہر آئندہ اقدام میں عزم و عمل اور اسباب کے ساتھ اپنی نظر حق سبحانہ وتعالیٰ کی مشیت پر قائم رکھے اور اسی پر بھروسہ رکھے۔ یہی ایمانی طریقِ فکر و عمل ہے اور اسی کے متعلق بشارت دی گئی ہے کہ اس کے ایمان کا اجر بھی ضائع نہ ہوگا اور مومن ان کے نتائج سے بغیر کسی انتظار کے برابر مستفید ہوتا رہے گا۔ پھر اسی کے بعد یہ حکم دیتے ہوئے کہ۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ۔

''اور یاد کر اپنے رب کو جب بھول جائے تو۔''

جس کا مطلب یہی ہوا کہ خدا پر ایمان لانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک دفعہ مان کر دماغ کے کسی گوشے میں اس کی یاد دفن کر دی جائے بلکہ چاہئے کہ زندہ خدا کے ساتھ مومن بندگی کے تعلق کو مسلسل زندہ رکھے اور جب کبھی غفلت ہو جائے تو پھر اس کی یاد تازہ کر کے اپنے اندر اس شعور کو بیدار کرتا رہے اور اسی کی آرزو کی جائے جیسا کہ فرمایا گیا ہے۔

وَقُلْ عَسٰۤى اَنْ یَّهْدِیَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا۔

''اور کہہ کہ میرا رب قریب ہے کہ اس سے زیادہ نزدیک رشد کی طرف ہماری راہنمائی فرمائے گا۔''

بظاہر اس کا مطلب وہی ہے کہ جب ''ایمانی زندگی'' کوئی اختیار کرتا ہے جیسا کہ کہف والوں نے اختیار کیا تھا تو ان کی ہدایت و راہنمائی میں مزید اضافہ کر دیا گیا اور بتدریج ترقی کرتے ہوئے۔

وَرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ

''باندھ دیا ہم نے ان کے قلوب پر''

نے مقام صحوت تک پہنچ گئے تھے اسی طرح یہاں بھی ''مومن'' کو توجہ دلائی گئی ہے کہ ایمان کے اس باطنی اجر کی اپنے رب سے توقع رکھے۔ جس طرح کہف والوں کے ایمان ''ربط قلب'' کے مقام رفیع ومنزل تک چڑھا کر ان کو پہنچا دیا تھا امید رکھے کہ اس کو بھی اپنے ایمان کا یہ اجر بارگاہ ربانی سے ارزانی ہوگا۔

اصحاب کہف کی مدت قیام قرآنی روشنی میں:

سچ پوچھئے تو قصہ اور قصہ سے قرآن مسلمانوں کو جو کچھ سمجھانا چاہتا تھا وہ اپنی آخری حد پر پہنچ چکا ہے لیکن سارے قصہ میں ایک جزئی یعنی انسانی زندگی کی غیر معمولی درازی اور غرائب ان لوگوں کی عقول کے لئے جو عزیز مقتدر کی کارفرمائیوں سے بیگانہ ہو کر جینے کے عادی ہیں ان کے لئے یہ جز یقیناً باعث گرانی وتشویش بن سکتی تھی۔ اس مسئلہ کو بھی قرآن آخر میں سمجھا دینا چاہتا ہے۔ اصحاب کہف کے قیام کی جو وقتی مدت تھی اس کو ان الفاظ میں قرآن نے بیان کیا ہے۔

وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا۔

''اور ٹھہرے رہے اپنے کہف میں تین سو سال اور بڑھا دیے انہوں نے ''نو سال'' اور

سنین کے بیان کرنے میں جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے تو تین سو سال ان کے قیام کی مدت بتائی گئی ہے پھر فرمایا کہ نو سال کا اور اضافہ ہوا اس کی توجیہ میں امام رازی سے نقل کیا ہے کہ:

كانت المـــدة ثلث مائة سنة من سنين الشمسية و تسع سنين من القمرية (ص:۶۰۔ جلد ۳)

''تین سو سال تو شمسی حساب سے ہوئے اور تین سو نو سال قمری حساب سے۔''

مگر یہ تو حساب کی بات ہے اصل غرضے کی بنیاد اس مقام پر ہے کہ انفرادی زندگی کی وقتی غیر معمولی درازی کا انسانی عواقب میں تجربہ عموماً نہیں کیا گیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جب ''دنیا'' ہی کی تلاش ہے تو ذرا کریدنے کی کوشش کرو اور سوچو کہ حوادث وواقعات جن کا ظہور عالم محسوس میں ہو رہا ہے اسباب وعلل کے سلسلے میں ان کی کڑیاں کیا صرف ''شہادت'' ہی کی حد تک

محدود ہیں یعنی حسی معلومات کی راہ سے عام انسانی عقل کی رسائی جن کڑیوں تک ہو سکتی ہے کیا علل و اسباب کا یہ تصور ان ہی پر ختم ہو جاتا ہے؟ کسی معمولی گھاس یا جنگل کی جڑی بوٹی ہی کو اٹھاؤ کون بتا سکتا ہے کہ قدرت کے کن کن عوامل کے زیر اثر اس گھاس یا بوٹی کا وجود منصۂ شہود تک پہنچنے میں کامیاب ہوتا ہے؟ جڑ، پتے، تنے، شاخیں، پھل، پھول خواص وصفات میں جن پیچیدگیوں کا تماشا اس قسم کے نباتات کی مختلف قسموں کے متعلق ہم دیکھتے ہیں کیا ان بوقلمونیوں کی توجیہ صرف جانے ہوئے اسباب و علل یا عوامل و موثرات سے جن کا عالم شہادت سے تعلق ہے یا ممکن ہے؟ اصحاب کہف کے قیام کی مذکورہ بالا بات کی خبر دیتے ہوئے اس کے بعد جو فرمایا گیا ہے کہ۔

قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا لَهٗ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

"کہو اللہ زیادہ جاننے والا ہے ان کے قیام کی مدت کو آسمانوں اور زمینوں کی پوشیدہ باتیں اسی کے لئے ہیں۔"

ان الفاظ سے قرآن یہی سمجھانا چاہتا ہے کہ اپنے محدود معلومات کو بنیاد بنا کر خدائی خبروں کی تکذیب کھلی ہوئی منطقی غلطی ہے۔ حق تعالیٰ کے دائرہ علم میں شہادت یعنی عالم محسوس کے قوانین کے ساتھ غیب کے قوانین بھی داخل ہیں۔ پھر جو نہیں جانتا ہے اسے خود سوچنا چاہئے کہ جاننے والوں کی خبروں کی تکذیب کا حق آخر کس بنیاد پر رکھتا ہے۔ علم الٰہی کے اسی احاطہ کو واضح کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے۔

اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ۔

کیا عجیب دیکھتا ہے وہ اور سنتا ہے۔

جس کا مآل یہی ہوا کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ جو کچھ معاملہ کرتے ہیں اس کی مصلحتوں سے ان کے سوا دوسرا کون واقف ہو سکتا ہے؟ یہی کہف والے نوجوان تھے۔ اپنے رب پر ایمان لا کر خدائی امداد کے مستحق ہوئے تھے حق تعالیٰ ان کے اخلاص اور راست بازی کو بھی دیکھ رہا تھا اور جو دعائیں اپنے مالک سے انہوں نے کی تھیں انہیں بھی وہ سن رہا تھا۔ اس نے چاہا کہ ان کے ایمان کا اور اپنے رب کے ساتھ حسن ظن کی جس نسبت کو انہوں نے قائم کیا تھا اس

کے آثار و نشانات یعنی تجربہ و مشاہدہ کا ان کو تجربہ کرنے کے بجائے مرنے سے پہلے انہوں نے جیتے جی دیکھا اور دوسروں کو بھی دکھا دیا گیا کہ غیبی تعبیروں کی کیسی عجیب و غریب شکلیں ان کے سامنے آئیں جن میں کچھ تو ایسی چیزیں ایسی بھی تھیں کہ عقل وقوع سے پہلے ان کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ مثلاً یہی تجربہ کہ جس زندگی کی طوالت عام حالات میں اسی نوے سال سے بھی کچھ ہی زیادہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھی گئی وہی زندگی تین صدیوں سے بھی آگے بڑھ گئی۔

اور یہ تو خیر علم و تجسس کا قصہ تھا۔ کہ جاننے والوں کی باتوں میں خواہ مخواہ شک اندازی نہ کرے۔ اس پر اصرار نہ کرے کہ اس کا تعلق جن باتوں کے دریافت کرنے سے ہے تو میرے علم کا علم بھی اس کے متعلق کا ساتھ دے۔ یقیناً ایسا اصرار جاہلانہ اصرار ہوگا۔

اور اسی سلسلے میں اپنی فہم رسائی کو قرآن نے اسی حد تک پہنچا کر چھوڑ نہیں دیا ہے بلکہ آیت ان الفاظ پر جو ختم ہوئی ہے۔

مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا يُشْرِكُ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَدًا۔

"نہیں ہے ان کیلئے اللہ کے سوا کوئی پشت پناہ اور نہیں شریک ہے اس کے حکم میں کوئی۔"

حیات انسانی کی طوالت محال عقلی بھی نہیں:

لوگ سرسری طور پر گزر جاتے ہیں۔ سمجھا جاتا ہے کہ قرآن کا شاید یہ کوئی اسلوب بیان ہے حالانکہ سچ پوچھئے تو جس "راز" سے پردہ مذکورہ بالا الفاظ سے ہٹایا گیا ہے اور "خالق و مخلوق" کے جس تعلق کو بے نقاب کر کے عالم اور اس کے نظام کے سمجھنے کی جو صحیح راہ قرآن نے پیش کی ہے اس کو سمجھ لینے کے بعد زندگی کی اس غیر معمولی طوالت ہی کا مسئلہ نہیں بلکہ اس نوعیت کے تمام مسائل کے متعلق وساوس و اوہام کے سارے سوراخ چھوٹے ہوں یا بڑے ہمیشہ ہمیش کے لئے قطعی طور پر بند ہو جاتے ہیں۔

میرے لئے تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں ہے مختصراً اس قرآنی قصہ کو یاد دلانا چاہتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ حضرت عزیر علیہ السلام سے اس قصہ کا تعلق ہے۔ ان پر سو سال کے لئے بجائے نیند کے موت طاری کی گئی پھر وہ زندہ کئے گئے ان سے بھی اسی مدت دریافت کی گئی جو مرنے کے

قیومیت کا مفہوم:

خالق و مخلوق کے اسی تعلق کی تعبیر حق تعالیٰ کی صفت قیوم کی طرف نسبت کر کے "قیومیت" کے لفظ سے کی جاتی ہے، جس کا مطلب یہی ہے کہ پیدا ہونے کے بعد یہ سمجھ لینا کہ مخلوقات اپنے تغیرات و انقلابات میں حق تعالیٰ کی تاثیری کارفرمائیوں سے آزاد ہو جاتی ہیں عالم کے نظام کے متعلق یہ قطعاً ایک غلط تصور ہے۔

اور اسی بنیاد پر ہمیں سمجھنا چاہئے کہ زندہ ہونے کے بعد موت کا تعلق زندہ ہونے والی شئی کی طبیعت و فطرت و مزاج وغیرہ مجہول چیزوں سے نہیں ہے بلکہ خدا کی مشیت، اس کا ارادہ، اس کا اذن جس چیز میں جب تک چاہتا ہے زندگی کو باقی رکھتا ہے اور جب چاہتا ہے زندگی سے اس کو محروم فرما دیتا ہے اور یہ قانون صرف زندگی یا حیات ہی کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ ہر مخلوق اپنے ہر تغیر کے ہر پہلو میں قیومیت کے اسی عام قانون کی تابع ہے اور اب سوچئے کہ اصحاب کہف کی طویل زندگی کے ذکر کے بعد جو یہ فرمایا گیا ہے۔

"نہیں (ان لوگوں کے لئے) اللہ کے سوا کوئی پشت پناہ"

یعنی "مالھم من دونہ من ولی" کا جو ترجمہ ہے اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ اتنی مدت تک ان لوگوں کے قیام میں حق تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے سے کسی قسم کی کوئی مدد نہیں مل رہی تھی اور کیسے ملتی؟ جب واقعہ یہ ہے کہ سارے نظام عالم کا واحد ہمہ گیر قانون ہی یہ ہے کہ

وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا۔

"اور نہیں شریک ہے اس کے حکم میں کوئی"۔

بس یہی واقعہ کی جب اصل حقیقت ہے تو اپنی پیدا کی ہوئی زندگی کو پیدا کرنے والا جب تک اس کا جی چاہے باقی رکھے اور جب چاہے ختم کر دے کسی دوسرے کی دخل اندازی کی گنجائش ہی کیا ہے۔ "خالق و مخلوق" کے باہمی تعلق کی یہی آخری نہیں بلکہ اجمالی یہ ذات ایمانی زندگی کا معراج کمال ہے۔ صوفیہ کی اصطلاح میں اسی کی تعبیر "وحدۃ الوجود" کے لفظ سے کی گئی ہے لیکن جو

جانتے ہیں انہوں نے ان پر الزام لگایا کہ وہ "وحدۃ الوجود" کے نظریہ کے مبلغ ہیں۔

وشتان ما بینہما، قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ۔

اصحاب کہف کی مدت قیام تاریخی نقطہ نظر سے:

اصحاب کہف کے قصہ کی حد تک قرآنی بیان گویا سمجھنا چاہئے کہ ختم ہو چکا ہے اگرچہ آگے کی آیتوں کا بھی براہ راست ان کی سرگزشت سے خواہ تعلق نہ ہو لیکن نتیجۃً اس قصہ سے وہ جدا نہیں ہیں بلکہ اسی قصہ سے پیدا ہونے والے نتائج ہی ہیں۔ ہم چاہیں تو ان کو بھی شمار کر سکتے ہیں۔ ان شاء اللہ اس کا ذکر آئندہ کیا جائے گا۔ سردست اصل قصہ کو ختم کر کے ایک ذیلی مسئلہ کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

کہنا یہ ہے کہ اس وقت تک تو کوشش میں نے اپنے بیان کو قرآنی الفاظ ہی کی حد تک محدود رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ارباب قصص و حکایت نے کہف والوں کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے میں نے قصداً اس سے تعرض ہی کیا ہے یا ضرورۃً بعض چیزوں کا ذکر اگر آ گیا ہے تو اس کی حیثیت ایک ذیلی بیان کی ہے اس وقت بھی ایک ذیلی بات ہی کا ذکر مقصود ہے۔

اصحاب کہف کے لبث (یا مدت قیام) کو بتاتے ہوئے قرآن نے جو یہ طریقہ تعبیر اختیار کیا ہے کہ "تین سو سال وہ ٹھہرے اور بڑھا دیا انہوں نے ۹ سال" امام رازی کی تفسیر سے نقل کر چکا ہوں کہ بعض لوگوں نے قرار دیا ہے کہ شمسی و قمری سالوں کے تفاوت کی طرف اس پیرایہ بیان سے اشارہ کیا گیا ہے لیکن خود امام نے اس پیرایہ پر یہ اعتراض کیا ہے کہ حساب کی رو سے یہ دعویٰ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ایسی صورت میں یہ سوال رہ جاتا ہے کہ آخر اس خاص طریقہ بیان کی مصلحت کیا ہے؟ اسی کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

قرآن کے الفاظ سے تو اس کا پتہ نہیں چلتا کہ اصحاب کہف کا یہ قصہ کس زمانے میں پیش آیا، لیکن اسلامی و غیر اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں نے جب منادی شروع کی اور دنیا کے مختلف حصوں میں وہ پھیل گئے تو ایشیائے کوچک کے اس مرکزی شہر افسس میں بھی بعض لوگ پہنچے اور حضرت عیسیٰ کے پیغام کی وہاں کے باشندوں میں تبلیغ شروع کی۔ عرض کر چکا ہوں کہ افسس کے باشندے بت پرست تھے ان کی بت پرستی دا

باب چہارم

احکام مندرجہ سورۃ کہف

اصحاب کہف کی سرگزشت کو ختم کر کے آگے چند احکام ہیں۔ آیئے اور ان کا مطلب سمجھئے اور دیکھئے کہ کہف والوں کے قصے سے ان احکام کا کیا تعلق ہے۔ پہلا حکم اس سلسلے کا یہ ہے۔

تلاوت کتاب:

وَاتْلُ مَآ أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ وَلَن تَجِدَ مِن دُونِهِ مُلْتَحَدًا ۝

"اور پڑھتا ❶ رہ جو وحی کی گئی تجھ پر تیرے رب کی کتاب سے نہیں ہے کوئی بدلنے والا اس کی باتوں کا اور ہرگز نہ پائے گا تو اس کے سوا یکسوئی کی کوئی جگہ"

حکم کی ابتدا واو عاطفہ سے کی گئی ہے اور اسی کا ترجمہ "اور" کیا گیا ہے جہاں تک میرا خیال ہے اور قاعدہ بھی یہی کو چاہتا ہے کہ عطف کے اس حرف واو کے بعد والا مضمون اپنے ماقبل کی عبارت کے مضمون سے مربوط ہے اسی ربط کو تلاش کرنا چاہئے۔

یاد ہوگا کہ منجملہ دوسری باتوں کے کہف والوں کے قصے کے دو لفظ "الرقیم" (جس کی تفسیر "الکتاب" کی گئی تھی) اور "فتیۃ" (نوجوانوں کی ٹولی جس کا ترجمہ کیا گیا تھا) قرآن کے ان دونوں لفظوں سے یہ اشارہ حاصل کیا گیا تھا کہ کہفی زندگی جس میں تہذیب و تمدن کے ہنگاموں سے آدمی الگ ہو جاتا ہے اس میں دماغی پستی ذہنی تعطل و جمود کا قدرتاً خطرہ جو پیدا ہوتا ہے اسی خطرے کے انسداد کے لئے قصہ کی اجمالی و تفصیلی دونوں تعبیروں میں "رشدی" صلاحیتوں کی حفاظت کی طرف خصوصی توجہ کی گئی ہے اور "رشد" یعنی سوجھ بوجھ فکر و نظر کے ملکہ و سلیقہ کو زندہ و تر و تازہ برسرکار رکھنے کے لئے عملی تدبیر ان ہی دو لفظوں الرقیم اور فتیۃ سے یہ سمجھ میں آتی ہے کہ

---

❶ بالتزام قراءۃ الکتاب الذی اوحی الیک۔ رازی نے "اتل" کی تفسیر کی ہے اسی لئے پڑھتا رہ ترجمہ کیا گیا ہے۔

كالذي استهوته الشياطين في الأرض حيران۔

"اس شخص کے مانند جسے جنوں نے زمین میں سرگرداں بنا رکھا ہو۔"

نئے طلسم میں پھنس کر بھٹکتی پھرتی ہے۔ تقریروں کا طوفان اُمڈتا ہے تحریروں کے انبار لگ جاتے ہیں۔ مگر بظاہر ان آوازوں سے عموماً اس زمانے کی یہ تقریریں و تحریریں لبریز و معمور ہوتی ہیں لیکن صحیح فکر کے ساتھ ان کا منطقی جائزہ جب بھی لیا گیا ہے یہی ثابت ہوا کہ جن کو پکارا جاتا ہے جیسے زندگی کے بنیادی حقائق سے وہ ناآشنا و بیگانہ ہیں تا آنکہ انسانی زندگی میں پکارنے والوں کا حال بھی ان سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے۔ بجائے بنیاد کے نظر آتا ہے کہ صرف سطح کے بیرونی تموجات و مظاہر میں خود بھی الجھے ہیں اور ان ہی سطحی چیزوں میں چاہتے ہیں کہ دوسروں کو بھی الجھا دیں۔ اس کا جو مال اندیشانہ کوششوں کا نتیجہ پہلے بھی یہی ہوا ہے اور اب بھی یہی ہو رہا ہے اور آئندہ بھی یہی ہوگا۔ یہ کہ کسی نجات کی کشتی جو آنکھ کی جھلی ہے کل وہی موت کی کھائی نظر آنے لگتی ہے۔ نت نئے اور اونچے بڑے نظریات جماعتیں جماعتوں کی ہوسناکیوں جسموں اور جسمانی تکلیفوں کی ٹھوکروں سے ٹوٹ کے ان بتوں میں انسانیت تہ و بالا کی جاتی رہتی ہے ان خود بینوں کی کسی کروٹ پر خود چین ملتا ہے اور نہ دوسروں کو چین لینے دیتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ بدنصیبی کے ان طوفانی ایام میں اگر مطالعہ کے لامتناہی ذخیرے ہر قسم کی کتابوں کے لئے وقف کر دیا جائے تو کیا وقت گزاری کے لئے ممکن ہے یہ اچھا مشغلہ ثابت ہو تو غور سے سوچئے کہ کبھی زندگی ایسی صورت میں "کبھی زندگی" باقی رہے گی یا وسعت مطالعہ کی یہ تفریح باہر سے خواہ جو کچھ بھی نظر آئے۔ درحقیقت خود کشی کی زندگی بن کر رہ جائے گی۔

حتیٰ کہ "الرقیم" اور اس کی تفسیر "الکتاب" سے انسانی اشارہ جو قصہ کہف کے بعد والے اس پہلے قرآنی حکم کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ اس حکم کے الفاظ کو پھر پڑھئے اور سوچئے۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں کسی کتاب ہی کے پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن یہ کون سی کتاب ہے؟ وہی کتاب جس کے لکھنے والے انسانی زندگی کو اپنی ذات کا موضوع بنا کر لکھتے چلے جا رہے ہیں مگر یہ طے کئے بغیر لکھتے چلے جا رہے ہیں کہ اس زندگی کی ابتداء کیا ہے انتہا کیا ہے اور ابتداء کی بنیاد پر اس کا مدعا کیا ہے یا کیا ہو سکتا ہے؟

بہرحال "الرقیم" یا "الکتاب" کا لفظ بھی مجمل یا جس حد تک بھی تشنہ ہو لیکن ما اوحی الیک من کتاب ربك (جو وحی کی گئی تجھ پر تیرے رب کی کتاب سے) کے الفاظ میں بھی "اجمال" و "ابہام" کا کوئی پہلو باقی رہ گیا ہے؟

یقیناً آدمی کے پالنے والے خالق کائنات ہی کی کتاب ایسی کتاب ہو سکتی ہے جس میں پڑھنے والوں کو اس وقت بھی روشنی مل سکتی ہے جب دنیا کا گوشہ گوشہ فتنوں کی تاریکیوں میں ڈوب گیا ہو۔ ہم اسی کتاب سے اپنی زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا صحیح غیر مشتبہ علم حاصل کر سکتے ہیں اور اسی میں ان غیر فانی "اٹل" امٹ اور لازوال سچائیوں کو پا سکتے ہیں جو زمانے کے انقلابی جھگڑوں سے نہ بدلے جا سکتے ہیں اور ماضی ہو یا حال و استقبال زمانے کے کسی حصہ میں نہ وہ کبھی غلط ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہی مطلب ہے۔

لا مبدل لکلمته

"نہیں ہے کوئی بدلنے والا ● اس کی باتوں کا"

کے الفاظ کا جنہیں اس فقرہ میں آپ پا رہے ہیں۔ آخر غیب ہو یا شہادت، گزرا ہوا زمانہ ہو یا آنے والا، جس کا علم محیط ہر ایک کو حاوی ہو اس کی باتوں کو کون بدل سکتا ہے اور غلطی کی ان میں گنجائش ہی کیا پیدا ہوتی ہے اسی لئے تو آخر میں فرمایا گیا ہے۔

وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا۔

"ہرگز نہ پائے گا تو اس کے سوا یکسوئی کی کوئی جگہ"

جس کا حاصل یہی ہے کہ کبھی کہئے یا یکسوئی کی ایسی زندگی جو واقعی کامیاب و نتیجہ خیز ہو ان لوگوں کو کبھی نہیں مل سکتی جو مخلوقات کے ساتھ خالق کی باتوں سے بھی بھرا کر ایسی زندگی گزار رہے ہیں یا گزارنے کا ارادہ کر رہے ہیں جس میں نہ مخلوق ہی کی بنائی کتابوں سے تعلق رکھا جائے نہ خالق کی اتاری ہوئی کتاب سے استفادہ کیا جائے۔

● مراد اس تبدیلی سے تغیر کی جہالت یا ناتجربہ کاری کی وجہ سے قانون میں ہوتی رہتی ہے ورنہ مریض کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق علاج میں ردوبدل طبیب کے علم کا عین اقتضاء ہے بلکہ عدم تبدیلی ایسی صورت میں طبیب کی جہالت کی دلیل ہے اور یہی مسئلہ نسخ کی بنیاد ہے۔

آہنگ ہوں اور باہم ایک دوسرے کے ظاہراً و باطناً ہم رنگ ہوں؟ ظاہر ہے کہ اس ایک لفظ سے ان سوالوں کا جواب نہیں مل سکتا مگر مذکورہ بالا پہلے حکم کے بعد پڑھئے اس دوسرے حکم کو یعنی:

تاکید صبر:

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ.

"اور تھامے رکھو اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو پکارتے رہتے ہیں اپنے پالنے والے کو صبح و شام اور مراد چاہتے ہوئے ہیں اسی کے رخ کو۔"

اس دوسرے حکم میں سب سے پہلے توجہ کا مستحق حکم کا پہلا لفظ اصبــــر کا ہے جس کا ترجمہ "تھامے رہو" کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ "صبر" کا مطالبہ عموماً نامناسب و ناموافق حالات ہی میں کیا جاتا ہے' اسی بنیاد پر اگر یہ سمجھا جائے کہ کامل ہم آہنگی اور یک جہتی و یک رنگی کی توقع "رفاقت کی زندگی" میں ترک کر لی چاہئے تو لفظ کا بھی اقتضاء یہی ہے۔ گویا شروع ہی میں "رفاقت کی زندگی" اختیار کرنے والوں کو چونکا دیا گیا ہے کہ اس راہ میں قدم رکھنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ "صبر" کے جذبہ کو ہر رفیق دوسرے رفیق کے متعلق زندہ و بیدار کر کے رفاقت کے رشتہ کو قائم کرے کیونکہ زندگی کے تمام شعبوں میں اول سے آخر تک ایک ایک نقطہ میں اتحاد کی امید تو شاید ایسے دو آدمیوں میں بھی نہیں کرنی چاہئے جو ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہوئے ہوں بلکہ نوعی قدروں کی وحدت کو قائم رکھتے ہوئے جیسے ظاہری شکل و صورت میں ہر آدمی کو قدرت نے دوسرے آدمی سے جدا کر دیا ہے اور اتنا جدا کر دیا ہے کہ جہاں ڈھال آواز لہجہ میں بھی بنی آدم کے دو فرد بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے بلکہ اپنے ان ہی بیرونی اختلافات کی وجہ سے آدمی پہچانا جاتا ہے۔ حالانکہ نوعی اقتضاؤں کے اعتبار سے دیکھئے گا تو ہر ہر شخص کی آنکھ کان ناک بلکہ ہر ہر عضو ہر ایک میں اسی جگہ نظر آتے ہیں جہاں پر دوسروں میں ہم ان کو دیکھتے ہیں۔ حالانکہ قدرت چاہتی تو جیسے آنکھیں چہرے پر لگائی گئی ہیں بجائے چہرے کے کسی میں ان ہی آنکھوں کو سر کے پچھلے حصے میں لگا دیتی مگر بایں ہمہ وحدت و کثرت کا یہ عجیب و غریب کرشمہ ہے اور ٹھیک جو حال بیرونی شکل و

یہ حق ہے کہ جن میں یہ صفات پائے جاتے ہیں وہ دین دار ہی ہوتے ہیں لیکن ہر دیندار میں ان صفات کو پایا جانا جہاں تک میرا خیال ہے ضروری نہیں۔ دینی زندگی رکھنے والوں کا ایک بڑا طبقہ ہر زمانے میں پایا گیا ہے جو آئین و قانون کی شکل میں زندگی کی دینی تنظیم ہی کو مذہب کا آخری مطالبہ سمجھتا ہے اور توقع رکھتا ہے کہ دینی زندگی بطور نتیجہ کے اس کے سامنے اسی طرح آ جائے گی جیسے تریاق کا استعمال صحت کے نتیجے تک مریض کو پہنچا دیتا ہے۔ ان کی نظر صرف قانون کی اہمیت تک محدود رہتی ہے اور قانون کے تعلق سے بجز قانونی تعلق کے کوئی رشتہ وہ رکھتے ہیں اور نہ رکھنا چاہتے ہیں جیسے مریض صرف طبیب کی بتائی ہوئی دواؤں سے یہ تعلق رکھتا ہے اور صحت کے لئے جانتا ہے کہ براہِ راست طبیب سے تعلق پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اور اسی کے مقابلہ میں دینداروں کا ایک طبقہ وہ بھی ہے جن کی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت وہی ہوتی ہے جسے انہی کی علامت ٹھہراتے ہوئے مذکورہ الفاظ میں قرآن نے ان کو روشناس کیا ہے۔

يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ۔

"پکارتے رہتے ہیں اپنے پالنے والے کو صبح و شام۔"

یہ ان لوگوں کی شناخت کی پہلی قرآنی علامت و نشانی ہے۔ علامہ شوکانی ان الفاظ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

كناية عن الاستمرار على الدعاء في جميع الاوقات (ج ۳ ص ۱۲۰)

"سارے اوقات میں دعا کرتے رہنا اسی کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے۔"

جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں کہ عربی زبان کے محاورہ کا اقتضا بھی یہی ہے۔ حاصل جس کا یہی ہوا کہ پرورش کرنے والی قوت رب کے ساتھ اپنے احتیاجی تعلق کے احساس کو ہمہ وقت مسلسل بغیر کسی انقطاع کے اپنے اندر زندہ اور بیدار رکھنا اور اسی احساس کے زیر اثر چھوٹی بڑی ضرورت میں اسی کی طرف چلنا اور اسی کو پکارتے رہنا یہی ان کی زندگی کا مشغلہ اور یہی ان کا اوڑھنا بچھونا بنا ہوا ہوتا ہے اور مختصر تام احتیاج مطلق فقط سوال صرف بھیک کی ان کی حس بن جو

"برتری و بلندی" کے اس پست ترین اخلاقی نصب العین کو شریک کرنے کے بعد "یزداں بکمند آور" کی ہمت مردانہ زیبائش و آرائش جذبہ زنانہ میں تحلیل ہو جانے کے سوا یقین مانئے کہ آئندہ کی ہر توقع حال کی ہر جنت کو جہنم ہی بناتی چلی جائے گی۔ جمہوریت کی بہشت اشتراکی حدود میں پہنچ کر جیسے آج جہنم کے نام سے رسوا ہو رہی ہے کون کہہ سکتا ہے کہ رسوائی کے اسی دردناک انجام سے کل اشتراکیت کو بھی دوچار ہونا نہ پڑے گا؟

کن لوگوں سے بچا جائے:

اور جانے بھی دیجئے بذات خود جن خطرناک نتائج کو عہد جدید کا یہ دجالی نصب العین اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے آپ کی نظر اگر وہاں تک نہیں پہنچ سکتی اور نقلی علاقہ ان پر جو چڑھائے گئے ہیں ان کو آپ ہٹا نہیں سکتے تعمیری ملمع کاریوں کی سطحی چمک دمک سے آپ کی نگاہیں خیرہ ہو رہی ہیں اس لئے خود "قول" کی تنقید کی آپ میں جرأت باقی نہیں رہی ہے تو آیئے قرآن بجائے "قول" کے آپ کے سامنے دیکھئے اس کے "قائل" ہی کو پکڑے لئے کھڑا ہوا ہے۔ پڑھئے اگر آپ پڑھ سکتے ہیں "لا تطع" (یعنی مت ماننا ان لوگوں کی باتوں کو) اس امتناعی حکم کو صادر کرتے ہوئے آگے جو فرمایا گیا ہے اور اسی پر یہ مضمون ختم ہوا ہے یعنی

مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔

"جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل بنا دیا ہے اور وہ پیچھے چل پڑا اپنی "ہوا" کے اور کام ہے اس کا "فرط" (غیر متوازن بے ڈھنگا)

معیار زندگی کی بلندی و برتری کا صور انسانی آبادیوں میں آج جو پھونک رہے ہیں اور اسی کا شور دنیا میں مچائے ہوئے ہیں ان کی پیشانی کی یہ قرآنی لکیریں کیا ایسی لکیریں ہیں جن کے لئے کچھ زیادہ غور و تامل کی ضرورت ہے۔ وہ جو بھی ہوں اور جہاں بھی کھڑے ہوں ان کے تمام خصوصیات میں شاید سب سے نمایاں یہی خصوصیتیں ہیں جنہیں ہر دیکھنے والا دیکھ سکتا ہے اور ان ہی قرآنی الفاظ سے ان کو پہچان سکتا ہے۔

بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ حدیثوں میں جیسے "المسیح الدجال" کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ "ک ف

سارے کام حدود سے متجاوز اور فرط ہوتے ہیں۔ شناخت کی یہ علامتیں اور نشانیاں جن میں پائی جاتی ہیں ان کے متعلق ایک تو منفی حکم "لاتطع" (مت اطاعت کرنا ان کی) کا دیا گیا تھا' جس پر بحث کر چکا ہوں۔ حاصل یہی ہے کہ ان ہی کو دیکھ کر قدم اٹھانا اور زندگی کے ہر پہلو میں ان ہی کے عملی نمونوں اور عملی مشوروں کی طرف تاکتے اور جھکتے رہنا' اس کی ممانعت فرمائی گئی ہے ایمانی وفاداریوں کے ساتھ جو جینا اور ان ہی پر مرنا چاہتے ہیں چاہیے کہ ان قرآنی علامتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں اور شائستہ و متمدن اقوام مہذب و تعلیم یافتہ نسلوں یا اسی قبیل جس قسم کی بھی خوشگوار تعبیروں' مطراق عنوانوں سے روشناس کراتے ہوئے بلانے والے ان کی طرف کیوں نہ بلا رہے ہوں' لیکن ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ قرآن کی بتائی ہوئی نشانیوں کے مطابق ان کا واقعی حال کیا ہے' اگر یہ نشانیاں ان میں پائی جاتی ہیں تو "مومن" کا فرض ہے کہ "لاتطع" (مت اطاعت کرنا اس کی) کے ربانی فرمان پر عزم و ارادے کی پوری قوت کے ساتھ ڈٹ جائے اور جب تک ان کی خواہشوں پر مذکورہ بالا سب کا سب قرآنی علامتوں کے داغ اور دھبے نظر آ رہے ہوں ان کی اطاعت سے چاہیے کہ "مومن" بھاگتا ہی چلا جائے۔

تبلیغ حق خواہ کوئی مانے یا نہ مانے:

مگر پرہیز و گریز ہی کی حد تک کا فرض اس سلسلہ میں کیا اسی نقطہ تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے؟ واقعہ تو یہی ہے اور تجربہ و مشاہدہ بھی بتا رہا ہے کہ "پرہیز و گریز" کے اس عزم پر بھی ٹانگوں کا ٹھہرنا آسان نہیں ہے بجز خاص خاص سعید اور توفیق یافتہ روحوں کے "لاتطع" (مت اطاعت کرنا) اس قرآنی حکم کی تعمیل میں صحیح معنوں میں شاید ہی کوئی کامیاب نظر آئے۔

لیکن کیا کیجئے کہ مومن کا وجود خواہ کیسی ہی کڑی اور کٹھن گھڑیاں ہوں لازمی وجود بن کر نہیں رہ سکتا' لازمی سے میری مراد ہے کہ اپنی ذات کی حد تک منافع کو محدود رکھنا ایمان کی شان تو یہ نہیں ہے۔ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی کھینچنا ایمانی بیعت کا بڑا اہم اقتضاء ہے۔ اب آگے قرآن کو پڑھئے اطاعت کے منفی و سلبی حکم کے بعد:

قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ.

"کہہ جو حق ہے تمہارے پالنے والے کی طرف سے۔"

جس سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حالات کیسے ہی گزرے ہوں اور کچھ بھی ہو رہا ہو لیکن بہرحال اور زندگی کی جو حقیقی سچائیاں ہیں ان کا اعلان بھی کئے چلا ہی جانا چاہیے۔ تقریر سے ہو یا تحریر سے یا قول کا جو بھی ذریعہ ہو مومن مکلف ہے کہ وہ ان سچائیوں اور صداقتوں کو دہراتا رہے مگر اس تبلیغی فرض کا مکلف بناتے ہوئے خلاف دستور قرآن میں اسی کے بعد:

فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ.

"پھر جس کا جی چاہے مانے اور جس کا جی چاہے (نہ مانے) انکار کرے۔"

کے الفاظ جو پائے جاتے ہیں ان سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حق کے مبلغ اور پہنچانے والے کو خواہ مخواہ اس کی امید نہ لگانی چاہیے کہ دنیا جن نفسیاتی حالات سے گزر رہی ہے ان میں میری بات سن ہی لی جائے گی۔ گویا اس عہد میں صرف پہنچا دینا "الحق" کا کہہ دینا یہی بڑا کام ہے شاید اس خاص موقع پر یہ اضافہ اسی لئے کیا گیا ہے کہ اپنی ناکامی اور نامرادی کو دیکھ کر جھنجھلانے اور مایوس ہو کر بیٹھ رہنے کی کیفیت ان لوگوں میں پیدا نہ ہو جو حق کے پہنچانے کا کام ان نازک و ناساز گار اور بدترین ناموافق حالات میں انجام دے رہے ہیں۔ ❶

بہرحال واقعہ یہ ہے کہ کہفی زندگی کی ضرورت جن حالات میں پیش آتی ہے ان حالات کی پیدائش کے اسباب، ان کے نتائج و عواقب پھر خود کہفی زندگی کے لوازم و آداب اس زندگی کے فرائض و واجبات، یہ اور اسی قسم کے تمام سوالات جن کا کہفی زندگی سے تعلق ہو سکتا تھا اگر سوچا جائے تو بقدر ضرورت ان باتوں کے جوابوں کو ہم ان آیتوں میں پا سکتے ہیں جن پر اب تک

---

❶ فعليك بخويصة نفسك۔ (خود اپنی خبر تجھے لینی چاہیے) بعض حدیثوں میں خاص حالات کے ذکر کے بعد جو اس کا حکم دیا گیا ہے یا قرآن میں "عليكم انفسكم لا يضركم من ضل اذا اهتديتم" (تمہیں اپنی نگرانی کرنی چاہیے جو گمراہ ہوا وہ تمہیں نقصان نہ پہنچائے گا اگر تم خود ہدایت یافتہ ہو) کا حکم جو پایا جاتا ہے ان سب کا یہی مطلب ہے کہ کامیابی کے لحاظ سے اس زمانے میں دوسروں کو دیکھنے کی ضرورت نہیں، اگر آدمی خود کامیاب ہو جائے تو یہی غنیمت ہے۔ باقی بلاغ الحق یعنی حق کو دوسروں تک پہنچانا اس حد تک تبلیغ کا حکم کسی خاص زمانے کی حد تک محدود نہیں ہے

بحث ہو چکی ہے۔ اسی لئے اب تک یہ التزام کیا گیا تھا کہ ایک ایک آیت کے تمام پہلوؤں کو تفصیل کے ساتھ سمجھنے والوں کے آگے پیش کر دیا جائے۔ اسی التزام کی وجہ سے مضمون میں کافی طوالت پیدا ہو گئی۔ لوگ ایک حد تک اکتا بھی چکے ہیں لیکن جس غرض سے یہ تذکیری سلسلہ قلم بند کیا گیا ہے، وہ غرض کم از کم لکھنے والے کا خیال یہی ہے کہ بغیر اس طوالت کے پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ مشکل یہ ہے کہ قرآن فہمی کے سلسلے میں مسلمان عموماً اس کے عادی بنا دیئے گئے ہیں کہ قرآنی آیتوں کی تلاوت کے بعد ان آیتوں کو تو وہیں چھوڑ دیا جاتا ہے اور قرآنی روایات، قصص کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس مضمون میں بالکل اس عام طریقہ کے برخلاف چونکہ صرف قرآنی آیتوں ہی کی حد تک عموماً محدود رہنے کی کوشش کی گئی ہے ممکن ہے کہ یہ بھی باعث گرانی بعض لوگوں کے لئے ثابت ہوا ہو۔ میں ان سے معافی کا خواستگار ہوں اور اب میں انہیں اس کی خوشخبری سنا ہوں کہ قرآن کی ایک ایک آیت اور اس کے ایک ایک لفظ پر غور و فکر کا بار ان پر نہ ڈالا جائے گا کیونکہ مقصد پورا ہو چکا ہے جہاں تک میرا خیال ہے آئندہ سورۃ کہف میں بعض ذیلی سوالوں کا جواب دیا گیا ہے جن کے لئے ایک اجمالی مضمون کافی ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ پڑھنے والے قرآن سے اجمالی مضمون کا مقابلہ بھی کرتے چلے جائیں۔

"الحق" کو پہنچانا چاہئے ماننے اور نہ ماننے کے خیال سے بے تعلق ہو کر پہنچانے کے لئے پہنچانا چاہیے" کہفی زندگی کے اس آخری اجمالی حکم کے بعد قرآن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نہ ماننے والے ظاہر ہے کہ اپنے "ظلمی" یعنی حدود سے متجاوز کاروبار کی وجہ سے ظلم کے مرتکب ہوں گے۔ کیونکہ ظلم نام ہی ہے قدرت کے نشان زدہ حدود سے الٹ جانے کا جس کے بعد ظالم کا قدرت اور اس کے مقررہ قوانین سے ٹکراتے ہوئے زندگی بسر کرنا ناگزیر ہے۔

اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسری زندگی میں ظالموں کا یہ طبقہ پائے گا کہ اس کے ہر احساس سے اور اس کی ہر خواہش سے قدرت اور اس کے قوانین متصادم ہیں۔ ظلم کی زندگی کے اس قدرتی نتیجہ کے قالب کا نام قرآن کی زبان میں جہنم، النار وغیرہ ہے جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں۔

ہر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے قرآن ظالمانہ زندگی کے اس نتیجہ سے مسلسل چونکاتا چلا گیا ہے

یہاں بھی حسب دستور اس نتیجہ کا اظہار "النار" (آگ) کے لفظ سے کیا گیا ہے۔ باقی بات تو عام ہے لیکن اس کے ساتھ اس خاص موقع پر ایک نئی چیز بھی "النار" کے ذکر کے بعد ملتی ہے جو اس مقام کے سوا اور قرآن میں کہیں نہیں ملتی۔ کہتے ہیں سرادق کا یہ لفظ خاص عربی لفظ بھی نہیں ہے بلکہ فارسی میں سراپردہ کا جو لفظ ہے اسی کی یہ معرب شکل ہے۔ بڑی بڑی ڈیوڑھیوں اور شاہی ایوانات کے داخلے کے ابتدائی پھاٹک پر بہت بڑا پردہ جو پڑا رہتا ہے اس کو فارسی میں سراپردہ کہتے ہیں۔

پس سرادق النار یعنی جہنم کے سراپردہ کا مطلب یہی ہے یا ہو سکتا ہے کہ جہنم بذات خود تو نہیں لیکن جہنم سے اسی قسم کا تعلق رکھنے والی چیز جو ڈیوڑھیوں اور شاہی ایوانوں سے داخلے کی پھاٹک کے سراپردہ کی ہوتی ہے سمجھا اسی قسم کی کوئی شے جہنم کا سرادق یا سراپردہ ہے۔ کہا گیا ہے کہ ظلم کی زندگی بسر کرنے والوں کے لئے دوسری زندگی میں جہنم تو خیر تیار ہی ہے لیکن دوسری زندگی سے پہلے قرآن نے خبر دی ہے کہ جن ظالموں کا ذکر اوپر گزر چکا یعنی وہی جن کی شناخت مسخ کا نہ علامتوں سے کرائی گئی تھی ان کو جہنم کا یہی سراپردہ گھیر چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے سامنے نہ جہنم ہے اور نہ جہنم کا سراپردہ پھر قرآن کی اس خبر کی تصدیق کی شکل اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کو بھی علامتوں اور نشانیوں ہی سے پہچانا جائے۔ قرآن نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک خاص بات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اپنے لفظوں میں ہم اگر سمجھنا چاہیں تو اسے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ اپنی آرزو اور خواہش کے مطابق یہ دیکھو کہ قدرت کی طرف سے ان کو کیا مل رہا ہے؟ اگر یہ نظر آتا ہو کہ مانگ رہے ہوں وہ پانی اور مل رہا ہو پانی کی جگہ کھولتا ہوا پگھلا ہوا تانبا تو جب یہ ہونے لگے اسی وقت سمجھ لینا چاہئے کہ جہنم کا سراپردہ ان پر چھوڑ دیا گیا اور اس کے احاطے میں وہ داخل ہو چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پانی کی آرزو اور خواہش تو ایک مثال ہے۔ مقصد وہی ہے کہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں قدرت کی طرف سے واقعات کا ظہور اس کے خلاف ہونے لگے وہ امن کے آرزومند ہوں تو جنگ کے شعلے بھڑکنے لگیں ارزانی پیدا کرنا چاہیں تو گرانی بڑھنے لگے وہ چاہتے ہوں کہ زندگی کی ضرورتوں کی بڑی سے بڑی مقدار مہیا کی جائے لیکن دیکھا یہ جا رہا ہو کہ عوام تو عوام ان کے خواص بھی معمولی ضرورتوں کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ امیروں اور

اسی طرح قدرتاً ایک ذیلی سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ الحیوۃ الدنیا کی زینت مراد بنا کر جینے والوں میں یہ ذہنیت جسے قرآن نے ان کی طرف منسوب کیا ہے یعنی اپنے پالنے والے پروردگار کی یاد سے ان کے دلوں میں غفلت کیوں پیدا ہو جاتی ہے؟ جسے سب سے زیادہ یاد رکھنا چاہیے اس کو کیوں بھول جاتے اور نتیجتاً حرص و ہوس کی پیروی کی بیماری میں مبتلا ہو کر زندگی کے طبعی نظام میں افراط و تفریط کی کیفیت کیوں پیدا ہو جاتی ہے؟

دو مثالی شخصیتوں کی تمثیل:

جہاں تک میرا خیال ہے آگے دو مثالی آدمیوں کا قصہ جو اس سورۃ میں بیان کیا گیا ہے اس میں اسی سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ مومن اور غیر مومن کی دو قسمیں ان حالات میں جو قائم ہو جاتی ہیں۔ ان دونوں کے طبقاتی خصوصیات کو سمجھانے کے لئے دو آدمیوں کا حال بیان کرکے جن میں سے ایک شخص کے متعلق کہا گیا ہے کہ انگور کے دو باغوں کا مالک حق تعالیٰ نے اس کو بنا دیا تھا اور ان دونوں کستانوں یعنی انگوری باغوں کو کھجور کے درختوں سے گھیر دیا گیا تھا گویا

(گزشتہ سے پیوستہ) کو صرف کرتے ہیں یعنی رہنے سہنے کی چیزوں میں جمال پسندی کے شوق کو نمایاں کیا جاتا ہے یا پھر لباس یعنی بدن کے ساتھ انسانی تعلق جن چیزوں کا ہوتا ہے ان کی تحسین سے اس جذبہ کی تسکین کا سامان لوگ مہیا کرتے ہیں۔ سورۃ کہف میں اس خاص مقام پر جنتی زندگی کے تذکرہ کے سلسلے میں یہ اضافہ جو کیا گیا ہے کہ "سندس و استبرق" کے سبز جوڑے ہیں "ارائک" چھپر کھٹوں پر جنت والے تمکن کریں گے۔ ظاہر ہے کہ مظاہر زینت کے ان دونوں قسموں ہی کے تو یہ نمونے ہیں۔ آدمی حسن و جمال کو ان امور کے سوا اپنے اعضاء دست و پا چشم و ابرو خد و خال میں بھی پسند کرتا ہے اسی مقام پر دیکھئے۔ حلوا اساور من ذهب (آراستہ کئے جائیں گے سونے کے اساور) اسی اساور کا ترجمہ لوگ کنگن کرکے گزر جاتے ہیں۔ حالانکہ بقول راغب اصفہانی اساور یہ لفظ عربی کا ہے بھی نہیں مانا جیسے سونے کا ذکر قرآن میں دوسری جگہ ان ہی اساور کو فضہ (چاندی) اور کسی کو لؤلؤ (موتی) کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے جیسا کہ قواریر من فضة (شیشے ہوں گے چاندی کے) سے سمجھا ہے کہ جنت میں تعبیر اعضاء ہوگا جس میں شیشے کی شفافیت اور چاندی کی چمک دمک جمع ہو جائے گی۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے ان اساور میں بھی سونے چاندی موتی کی مجموعی خوبیاں یکجا ہوں گی اور ان کے استعمال سے اعضاء کے حسن و جمال میں جو اضافہ ہوگا اسی کی طرف جو لکھا گیا ہے وضو والی حدیثوں میں بھی ہے کہ خاص قسم کی چمک ان اعضاء میں نمایاں ہوگی جو وضو میں دھوئے جاتے ہیں جس کی تعبیر غرّاً محجلین کے الفاظ میں کی گئی ہے۔۱۲

ان باغستانوں کی باڑ بھی بجائے خاردار جنگلی درختوں کے ایسے درختوں سے تیار کی گئی تھی جو خود بھی پھل لانے والے درخت تھے۔ پھر ان دونوں باغوں کے متعلق یہ بھی خبر دی گئی ہے کہ ان دونوں کے بیچ میں قدرت کی طرف سے نہر بھی جاری کی گئی تھی، باغ کی سیرابی و آبیاری کی ضمانت کی طرف جس سے اشارہ کیا گیا ہے۔ ایسے دو باغ جن کے بیچ میں قدرتی چشمہ پھوٹ پڑا ہے اس کی خشکی اور بے ثمری کا بھلا کیا اندیشہ ہو سکتا ہے؟ نیز ان ہی باغوں کے درمیان کھیتی بھی تھی اور باغ ہو یا کھیت پیداوار میں کوئی کمی نہ تھا۔ اسی کے ساتھ وکان له ثمر کے تلفظ میں قرأ کا اختلاف ہے، بہرحال مستند اہل لغت کے حوالہ سے امام رازی وغیرہ مفسرین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ان باغوں کے سوا زر و نقرہ کے مسکوک و غیر مسکوک ذخیرے کا بھی مالک تھا۔ الغرض کافی مال و دولت کا بھی مالک علاوہ کھیتوں اور باغوں کے تھا، جن کی آمدنی ممکنہ خطرات سے محفوظ تھی۔ اس کی ان خصوصیات کا تذکرہ کرنے کے بعد بیان کیا گیا ہے کہ ایمانی صف کے ایک آدمی سے یہی باغ اور مال و دولت والا گفتگو کرتے ہوئے کہنے لگا کہ میں دولت میں بھی تم سے بڑھا ہوا ہوں اور میرے ساتھ جو لوگ ہیں اور جس طبقہ سے ہمارا تعلق ہے وہ عزت و جاہ میں بھی تم سے کہیں زیادہ و بلند و برتر ہیں۔ قرآن میں وهو ظالم لنفسه کے الفاظ اسی باغ والے دولت مند کی طرف منسوب کئے گئے ہیں جس کا مطلب یہی ہوا کہ قدرتی طبعی مقام سے اپنے آپ کو وہ ہٹائے ہوئے تھا۔ بظاہر اس سے یہی کچھ سمجھ میں آتا ہے کہ باغ اور اس کی تروتازگی، بارآوری اور دولت و ثروت کا جو ذخیرہ اس کے پاس تھا اور انسانوں کی جو جماعت اس کے ساتھ جمع ہو گئی تھی ان ساری باتوں کو بجائے حق تعالیٰ کے فضل و کرم کے اپنی جسمانی و دماغی کوششوں کا نتیجہ قرار دیتا تھا۔

شرک کی جدید قسم:

اس سارے قصے میں قرآن کے بعض الفاظ خاص طور پر مستحق توجہ ہیں۔ آگے اسی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا وہ منکر نہ تھا اور رب کے نام سے خدا کو موسوم کرتا تھا۔ اسی کے ساتھ جیسا کہ آگے معلوم ہوگا قرآن میں اس کی طرف "شرک" کے عقیدے کو منسوب کیا گیا ہے۔

حالانکہ اس پورے قصے میں اس کے کسی مشرکانہ فعل بت پرستی وغیرہ کا ذکر نہ صراحۃً ملتا ہے اور نہ اشارتاً جہاں تک میرا خیال ہے جس شرک کو اس کی طرف قرآن نے منسوب کیا ہے وہ بت پرستی والا شرک نہیں ہے بلکہ ہم شرک کی اس شکل کو ان لوگوں میں دیکھ سکتے ہیں جو خدا کے منکر بھی نہیں ہوتے۔ یعنی یہ بات کہ "عالم کو خدا نے پیدا کیا ہے" اس کا انکار نہیں کرتے مگر اسی کے ساتھ سمجھتے ہیں کہ اپنی قسمت کے ہم خود "بلڈر" اور معمار ہیں۔ گویا خلق و پیدائش کی حد تک خدا کی ضرورت ان کے نزدیک ختم ہو جاتی ہے۔ آگے کائنات اور اس کے قوانین ہیں جن کے ساتھ انسان کشمکش میں مصروف ہے۔ اس کشمکش میں کامیاب ہونے کے لئے خدائی امداد سے اپنے آپ کو مستغنی خیال کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ خدا کے ساتھ شریک کرنے کی یقیناً یہ ایک مستقل اور شاید بدترین شکل ہو سکتی ہے۔ جس زمانے سے ہم گزر رہے ہیں اس میں شرک کی دقیانوسی شکل جس کی بنیاد اوہام پر قائم تھی یعنی بت پرستی والے شرک سے زیادہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شرک کی یہی جدید شکل عام ذہنیتوں پر مسلط ہے بجائے اوہام کے اس کو حکمت و دانش کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے گویا پرانے شرک کے مقابلہ میں شرک کی یہ ایک سائنٹفک قسم ہے۔ اس نوعیت کی مشرکانہ ذہنیت کے جو شکار ہیں لوگ ان کو کہتے ہیں کہ وہ ملحد اور دہریے ہیں۔ عموماً سمجھا جاتا ہے کہ خدا کے وہ منکر ہیں۔ حالانکہ بجائے انکار کے ان کی ذہنیت کی صحیح تعبیر "اشتغال قلب عن ذکر الله" ہی ہو سکتی ہے یعنی منکر نہیں بلکہ حق تعالیٰ کی یاد سے ان کے دلوں کو غافل بنا دیا گیا ہے۔

بہرحال اپنے متعلق اسی ظالمانہ احساس کے ساتھ یعنی یہ جو کچھ بھی ہے سب میری کد و کاوش میری عقل و دانش غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ اسی احساس کے ساتھ قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ باغ میں داخل ہوا اور جن مختلف بنیادوں پر اپنے معاشی نظام کو اپنے خیال کے مطابق اس نے قائم کیا تھا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا میں خیال کرتا ہوں کہ یہ نظام میں نے جو قائم کیا ہے لازوال ہے۔ ما اظن ان تبید هذه ابدا کے دعوٰی کا یہی حاصل ہے۔ یہ خیال کہ یہاں کی ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔ جب وہ ختم ہو جاتی ہے بظاہر اسی عام عقیدے کا الساعة (مقررہ وقت) کے لفظ سے ذکر کر کے اس نے یہ بھی کہا کہ اس مقررہ وقت کا خطرہ میں خیال کرتا

جس سے وہ سیراب ہوتا ہے؟ اس کے درخت کے بیج سے نکلنے والی شاخیں، پھل، پھول ان میں سے کوئی ایسی چیز ہے جسے تو نے وجود بخشا اور پیدا کیا ہے؟ یقیناً یہ سب کچھ اسی کی مشیت اور ارادے کے مظاہر ہیں جس نے عالم کے اس نظام کو پیدا کیا ہے۔ رہی تجھے اپنی عقل و فراست سمجھ بوجھ اپنی محنت و مشقت اور سعی و کوشش کی قوتوں۔ کے متعلق جو یہ خیال ہے کہ ان ہی کی مدد سے ان قدرتی پیداواروں کی تنظیم میں تو کامیاب ہوا ہے تو اسی کے ساتھ تجھے یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ تجھ میں یہ قوتیں کہاں سے پیدا ہوئی ہیں؟ یقیناً اپنے اندر ان قوتوں کو تو نے خود نہیں بھرا ہے بلکہ یہ ساری توانائیاں تجھ میں وہیں سے آئی ہیں جو کائنات کی ساری قوتوں اور طاقتوں کا سرچشمہ ہے مرد مومن کے الفاظ:

وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَاشَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

"اور ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب داخل ہوا تو اپنے باغ میں تو کہتا کہ سب اللہ کا چاہا ہوا ہے (اور جن قوتوں سے باغ کی تنظیم ہوئی) نہیں ہے کوئی قوت مگر اللہ ہی سے۔"

کم از کم ان لفظوں کا مفاد میرے ذہن میں تو یہی آیا ہے اور ہے بھی یہی واقعہ کہ سارا عالم "ماشاء اللہ" (جو کچھ چاہا اللہ نے) اور آدمی اپنے اندر جن توانائیوں اور طاقتوں کو پاتا ہے ان سب کی حقیقت لا قوۃ الا باللہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے گویا آفاق و انفس دونوں کو صرف ان دو فقروں میں بند کر دیا گیا ہے۔

بہر کیف عہد جدید کا جدید شرک اور س۔ کے۔ نئے قالب۔ کے مقابلے میں ایمان کی حفاظت کے لئے آپ ہی سوچئے کہ اس سے زیادہ منطقی حکیمانہ طریقہ تفہیم اور کیا ہو سکتا ہے شرک کی اس نئی قسم کے مشرکوں کی سمجھ اگر اس سے بھی درست نہ ہو تو پہلے ہی فرمایا گیا ہے کہ تم "الحق" کو کہہ دیا کرو۔ ماننے نہ ماننے کے قصے میں خواہ مخواہ اپنے آپ کو جلاتے نہ کرو۔ مومن کی ایمانی تسلی کے لئے یقیناً قرآن کا یہ تمثیلی قصہ بمنزلہ ایک ایسی مثال کی حیثیت رکھتا ہے جس کا ہر مقدمہ بدیہی اور نتیجہ فطری ہے اور اس مثالی قصہ کو اشخاص اور خاندانوں کے ساتھ ساتھ چاہا جائے تو اقوام و امم پر بھی تھوڑی سی وسعت نظر سے کام لیتے ہوئے منطبق کیا جا سکتا ہے۔ آج زمین کے بسنے والے پر

ایسی قوموں اور راستوں کی کی گئی ہے جن کے قبضے میں اناج اور غلہ، پھل اور میوے پیدا کرنے والے بڑے بڑے وسیع علاقے پائے جاتے ہیں اور جن کے مقبوضات میں بڑے بڑے دریا مثلاً پرانے متمدن ملکوں میں دجلہ و فرات، سیحون و جیحون، گنگا و جمنا، گوداوری و کرشنا اور نو دولت ممالک میں مسی سی پی، اوکن (امریکہ) ، والگا اور نیپر ● (روس) وغیرہ پہلے بھی تھے اور آج تک بہہ رہے ہیں، جن میں زرعی اور بستانی پیداواروں اور صنعت و حرفت اور تجارت کی راہوں سے سرمایہ کے سمندروں کو ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔

☆☆☆

● یہ دلچسپ لطیفہ ہے کہ جیسے گنگا جمنا کو ہندوستان والے "ماتا" کہتے ہیں اسی طرح روس میں "والگا ماتا" اور نیپر کو "نیپر پتا" کہتے تھے اور شاید اب بھی کہتے ہوں۔

باب پنجم

تشریحات سورۂ کہف

حیاتِ دنیا کی پہلی تمثیل کا حاصل:

افراد ہوں یا اقوام، مومن اور غیر مومن کے درمیان جو مکالمہ ہوا ہے دونوں پر اسے آپ منطبق کر سکتے ہیں۔ آخر میں مکالمہ کو ختم کرتے ہوئے مردِ مومن اور سے قسم کے اس مشرک سے کہا کہ میری تنگی اور آبادی کی قلت کے ساتھ طنز کرتے ہوئے اپنی برتری اور بڑائی کے جس فخر کا اظہار میرے سامنے تم نے کیا ہے۔ اس کے جواب میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ باغ اور اس کی زرعی و ثمری پیداوار سے جو معاشی آسانیاں آج قدرت کی طرف سے تمہارے لئے مہیا کی گئی ہیں اسی قدرت والے خدا سے میں تو توقع رکھتا ہوں کہ تم سے بہتر جنت (باغ) مجھے بھی عطا کرے گا گویہ تم سے بھی زیادہ آسمان، آسان معاشی ذرائع ہمارے لئے خدا مہیا کرے۔ مردِ مومن نے صرف اس توقع کا ذکر کیا۔ علاوہ اس نتیجہ کے کہ دنیاوی زندگی میں بھی معاشی سہولتوں کی توقع ایمانی زندگی کے منافی نہیں ہے۔ ایک بات اس موقع پر سوچنے کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مالی قلت اور آبادی کی قلت کا جو طعنہ مردِ مومن کو دیا گیا تھا اس طعنے کے مقابلہ میں سرمایہ کی فراوانی اور آبادی کی اکثریت کی توقع کا اظہار کیوں نہیں کیا گیا۔ جب امید ہی لگائی تھی تو مقابلۃً ان دونوں باتوں کی بھی امید لگا سکتا تھا۔ بظاہر اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ معاشی سہولتوں کے مہیا ہو جانے کے بعد خواہ مخواہ محض فخر و غرور کے لئے سرمایہ اور آبادی کی کثرت کی فکر میں گھلنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

خیر یہ تو مردِ مومن نے اپنے متعلق کہا۔ اسی کے ساتھ چونکاتے ہوئے اس مشرک مردِ غیر مومن کو اس نے توجہ دلائی کہ جس باغ اور معاش کی جن سہولتوں پر تو ناز کر رہا ہے اور اپنی کوششوں

کا نتیجہ ان کو بھگتنا ہوگا۔ مولانا آسمانی "حسبان" ❶

یعنی ان کے متعلق حساب دینے کی گھڑی تمہارے سر پر منڈلا رہی ہے اور جس قدرت کا یہ عطیہ ہے حساب لینے کے بعد وہی قدرت باغ کی زمین کو نشوونما کی صلاحیتوں سے محروم کر دے اور تمہیں پانی کے جس ذخیرے پر اعتماد ہے یا تو وہ ختم کر دیا جائے اس طور پر ختم کر دیا جائے کہ آب برآری کی ساری تدبیریں پانی کے برآمد کرنے میں ناکام ثابت ہوں۔

تاریخ کے صفحات آسمانی "حسبان" کے ان دونوں مثالوں سے لبریز ہیں۔ کتنے زرخیز ممالک آج بنجر میدانوں کی شکل میں پڑے ہوئے ہیں۔ مرد مومن نے ان ہی تاریخی مثالوں کی طرف گویا اشارہ کیا۔ یہاں تک مکالمہ ختم ہو گیا۔ آگے قرآن میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ مرد مومن کی پیشگوئی یا آسمانی "حسبان" کی دھمکی اس عصری یا مادہ پرست مشرک کے سامنے واقعہ بن کر آ گئی۔ معاشی سہولتوں، سرمایہ کی بہتات، برتری و بلندی کے سارے تماشے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور کف افسوس ملتے ہوئے اب اس کو احساس ہوا کہ عقلی وجسمانی جدوجہد کو بنیادی رکھتے ہوئے بھی میرا قائم کردہ معاشی نظام تہ وبالا ہو گیا تو اس کی وجہ بجز اس مشرکانہ ذہنیت کے اور کیا ہو سکتی ہے جس میں مبتلا ہو کر میں نے یہ باور کر لیا تھا کہ قدرتی کاروبار میں خود میری عقل و فراست سوجھ بوجھ سعی و محنت بھی شریک ہے اور اب اس کی سمجھ میں آیا کہ کائنات کی ولایت و حکمرانی صرف خدا ہی کی ذات کے ساتھ مختص ہے۔ اپنی مشرکانہ ذہنیت پر بیچارہ پچھتاتے ہوئے جیسا کہ قرآن میں نقل کیا گیا ہے کہتا تھا۔

يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا۔

"اے کاش! میں شریک نہ بناتا اپنے رب کے ساتھ کسی کو"

اور یہی فقرہ جیسا کہ میں کہتا چلا آ رہا ہوں اس سارے قصے میں سب سے زیادہ اہم ہے عرض کر چکا ہوں کہ غیر خدائی قوتوں کی پوجا پاٹ والے شرک کا پورے قصے میں نہ اشارۃً ذکر ہے اور نہ صراحتاً۔ مفسرین بھی حیران ہیں کہ جس شرک پر پچھتا رہا تھا اس کی نوعیت کیا تھی۔ شرک

❶ حسبان کے چند معانی ارباب تفسیر نے لکھے ہیں لیکن لفظ و معنی ہر دو لحاظ سے جس مطلب کو میں نے درج کیا ہے وہ زیادہ مناسب ہے۔

خفی کے نام سے مسلمانوں میں ایک اصطلاح جو مروج ہے جس میں یہ مانتے ہوئے کہ کائنات کے ذرہ ذرہ کی کارفرمائیاں براہ راست حق تعالیٰ کے ارادہ ومشیت کی تابع ہیں اور اس معاملہ میں خالق کائنات کا کوئی ساجھی اور شریک نہیں ہے' خیر و شر اللہ تعالیٰ کی ہی طرف سے ہے لیکن باوجود اس یقین وایمان کے اسباب کے راہ سے پیدا ہونے والی چیزوں کے متعلق اسباب کی دخل اندازی کا خیال بھی دلوں میں گزر جاتا ہے' ان ہی اسباب میں ارادہ واختیار کا وہ عنصر بھی ہے جس کی نوعیت خواہ کچھ ہی ہو لیکن ہمارے اختیاری اعمال وافعال پر اثر اندازی کا تعلق انسانی وجود کے اس عنصر سے بھی ہے۔ کچھ ان ہی باتوں کا نتیجہ یہ شرک خفی ہے۔ مومن کے لئے جس کی حقیقت سچ پوچھئے تو وسوسہ اور خطرہ ہی کی ہوتی ہے۔ لیکن ایمان کے اعلیٰ مدارج کا تقاضا یہی ہے کہ اس وسوسہ کے لئے بھی قلب میں گنجائش نہ چھوڑی جائے۔ بالفاظ دیگر شرک خفی میں بھی استقلالی حیثیت خداوند اس کے حکم وارادہ ہی کو حاصل ہوتی ہے اور اسباب وعلل کا خیال محض ایک ضمنی عارضی خیال کی حیثیت سے آ جاتا ہے۔ برخلاف اس کے اس باڑ والے آدمی پر شرک کی جس ذہنیت کو ہم مسلط پاتے ہیں' اس میں شرک خفی کے قطعی برعکس ساری کارفرمائیوں کو اسباب ہی کی طرف منسوب کرنے پر اصرار کیا جاتا ہے اور خدا کا انکار تو نہیں کیا جاتا لیکن دنیا کے کاروبار میں اس کی مشیت وارادے کا خیال ہی نہیں آتا یا آتا ہے تو اسی طرح جیسے شرک خفی میں اسباب وعلل کی طرف بھی کبھی موحد کا دھیان منتقل ہو جاتا ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ شرک کی تمام قسموں میں یہ اس کی بدترین قسم ہے۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ دجالی فتنہ سے رسول اللہ ﷺ نے جس سورۃ کا تعلق بتایا ہے خصوصیات کے ساتھ اسی سورۃ میں شرک کی اس قسم کا ذکر کیوں کیا گیا ہے۔ اس کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ اس فتنہ کے ایام میں اس قسم کی مشرکانہ ذہنیت میں لوگ عام طور پر مبتلا ہو جاتے ہیں ❶ ضرورت ہے کہ ہر شخص اپنے دل و

❶ ہندوستان کے مسلمانوں میں اس ذہنیت کے ساتھ شروع شروع میں جو نمایاں ہوئے ابتداً عام مسلمانوں کی طرف سے "نیچری" کا خطاب ان کو دیا گیا تھا وجہ اس کی یہی تھی کہ عالم کے سارے کاروبار کو یہ لوگ نیچر کی طرف منسوب کرتے تھے گو خدا کے منکر نہ تھے لیکن کائناتی کارفرمائیوں میں خدا کی چنداں ضرورت ان کے نزدیک باقی نہیں سمجھتے تھے کہ یہ سب کچھ تو نیچر کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ مسلمان (بقیہ اگلے صفحہ پر)

دماغ کا جائزہ لے اور دیکھے کہ شرک کی اس ماڈرن اور عصری شکل سے وہ کتنا متاثر ہے۔ کم از کم ایک مومن کو اس کے سوا اور کچھ سوچنا نہ چاہیے کہ دنیا ہو یا آخرت کسی میں بہترین نتائج اور بہترین انجام کی ضمانت صرف اس یقین میں پوشیدہ ہے کہ عالم کی ولایت اور کارفرمائی صرف حق تعالیٰ کی ذات پاک کے ساتھ محدود و مختص ہے اور یہی مفاد و مطلب ہے قصے کے آخری فقرہ کے الفاظ کا:

هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ عُقْبًا.

"وہاں معلوم ہوتا ہے کہ سچی ولایت (عالم کی) صرف اللہ ہی کے لئے ہے، بہتر ثواب (نتیجہ کے لحاظ سے بھی) اور بہتر ہے عاقبت (انجام) کے لحاظ سے بھی۔"

حیات دنیا کی دوسری تمثیل:

مذکورہ بالا مشرکانہ ذہنیت کے سوا اللہ کی یاد سے غافل ہو جانے والے دلوں میں جو دوسری کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ وہی ہے جس کا مشاہدہ ناقصوں کی جماعت میں ہم کر رہے ہیں یعنی ختم غیر ختم کی زندگی کا جو محدود وقفہ ہے۔ اسی محدود وقفہ پر ساری انسانی توانائیاں گردش کرنے لگتی ہیں اور آدمی کی زندگی جو پیدا ہونے کے بعد درحقیقت ختم نہیں ہوتی اس کے متعلق حد سے زیادہ تنگ نقطۂ نظر پر یہ اصرار اسی غفلت کا خمیازہ ہے جسے ذکر اللہ کے بھولنے والے بھگت رہے

(گذشتہ سے پیوستہ) ان کے اس دعویٰ سے بجز اس کے کہ نکلیں گے ہم، نکلا کیا ہے؟ صاف لفظوں میں جیسا کہ چاہیے تھا اعتراض کرنے والوں کے سامنے بھی اس سلسلے میں کوئی متعین بات نہ تھی۔ حالانکہ یہ شرک کی اسی ماڈرن شکل ہے جس میں خدا کو معطل ٹھہرا کر غیر خدائی قوتوں کے ساتھ عالم کے نظام کو وابستہ سمجھا جاتا ہے۔ یقیناً ملت کی اس تحریری کشمکش کی تاریخ میں پوجا پاٹ والے مشرک سے بھی شرک کی یہ شکل بڑھی ہوئی ہے۔ کیونکہ پوجا پاٹ والے حق تعالیٰ کی حد تک خدا ہی کی طرف ہر فعل کو منسوب کرتے تھے صرف عبادت و دعا میں غیر اللہ کو شریک ٹھہراتے تھے قرآن میں بجز اس کے پرانے مشرکوں کی طرف ربوبیت والی توحید کا عقیدہ منسوب کیا گیا ہے گویا "ایاک نستعین" (تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں) اس پر قائم رہتے ہوئے "ایاک نعبد" (تجھ ہی کو ہم پوجتے ہیں) سے یہ مشرک بنے ہوئے تھے لیکن شرک کی اس جدید قسم میں استعانت والی توحید بھی باقی نہیں رہی ہے۔ نئے مشرکوں میں دعا و عبادت وغیرہ کی اہمیت اس لئے باقی نہیں رہی ہے کہ خدا کو عالم کے کاروبار میں جب دخل ہی نہیں ہے تو اس سے مانگنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہی۔

ہیں۔ شرک کے بعد یہ دوسرا نتیجہ اغفال قلب کا تھا۔ اسی کو سمجھاتے ہوئے زندگی کے موجودہ عبوری دور الحیوۃ الدنیا کو قرآن نے اس تمثیل سے سمجھانا چاہا ہے کہ بارش ہوتی ہے زمین پر بکھرے ہوئے دانے بارش کے پانی سے مل کر لہلہا اٹھتے ہیں مگر چند ہی روز کے بعد خشک گھاس پھوس بن کر اڑ جاتے ہیں اور سارا تماشا اسی پر ختم ہو جاتا ہے ظاہر ہے کہ آدمی زندگی کے موجودہ عبوری دور کا بھی یہی حال ہے۔ پھر مال، دولت، بال بچے اس کے اردگرد جمع ہو کر دوسروں کے لئے اس کی زندگی قابل رشک بنا دیتے ہیں لیکن موت سارے قصے کو درہم برہم کر دیتی ہے لہذا کس بیکی کی ہے کہ المال والبنون (سرمایہ اور اولاد) کے وقتی طمطراق میں اپنی مدد کاوش اور محنت و مشقت کے پسینے کے ایک ایک قطرے کو لگا دیا اور ان پہلوؤں سے قطعی بے تعلق ہو کر لگا دیا جن کے نتائج باقی رہنے والے ہیں اور مستقبل کی ساری رونق ان ہی کے ساتھ وابستہ ہے کہاں تک عقل کا تقاضا ہو سکتا ہے؟ بارش والی تمثیل کے آخر میں خاص طور پر قابل توجہ اس کے یہ آخری الفاظ ہیں:

وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا۔

"اور ہے اللہ ہر بات پر قادر"

بظاہر اس میں اشارہ کیا گیا ہے کہ خشک دانے زمین پر بکھرے ہوتے ہیں لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ پانی برسا کر قدرت ان ہی خشک دانوں کو ہرا بھرا کر کے نمایاں کرتی رہتی ہے اور پھر خشک کر دیتی ہے۔ جس قدرت کے اس عمل کو مسلسل آدمی دیکھتا رہتا ہے۔ اسی قدرت کے متعلق اس بدگمانی میں مبتلا رہنے کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے کہ موت کے بعد پھر زندگی کو دوبارہ وہی قدرت نمایاں نہیں کر سکتی؟ آخر زندگی کو شکم مادر و شکم قبر ہی کے دو قفے تک محدود قرار دینے پر اصرار کرنے والے اپنے اس تنگ نقطہ نظر کی تائید کے لئے قدرت کے متعلق کس مشاہدے کو پیش کر سکتے ہیں۔ خصوصاً جب اس کی مخالف شہادتوں سے دنیا بھری ہوئی ہے۔

بہرحال جن لوگوں کو سمجھایا جاتا ہے کہ مر کر تم فنا نہیں ہوتے مگر وہ یہی کہتے جاتے ہیں کہ ہم تو فنا ہی ہو کر رہیں گے ان کو تسلی دی جاتی ہے کہ ہر پیدا ہونے والا آدمی بہرحال باقی رہتا ہے لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ نہیں ہم معدوم اور نیست و نابود ہو جائیں گے ان ہی کو قرآن نے آگے مطلع

کیا ہے کہ اپنی مرضی سے پیدا ہونے والے جس طرح پیدا نہیں ہوتے اسی طرح اپنی خواہش کے مطابق کوئی اپنے آپ کو فانی و معدوم کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا بلکہ جو کچھ زندگی کے موجودہ دور میں اس نے کیا ہے اس کے نتائج آئندہ زندگی کی شکل میں اس کے سامنے اس وقت آئیں گے جب عالم کا موجودہ نظام پلٹ دیا جائے گا۔ جو چیزیں اس وقت ساکن ہیں وہ اس انقلابی دور میں متحرک ہو جائے گی اور جو اندر ہے وہ باہر ہو کر سامنے آ جائے گا اور اس وقت دیکھنے والے دیکھیں گے کہ ان کے سارے کرتوت چھوٹے ہوں یا بڑے جو بظاہر ناپید ہو چکے تھے ایک ایک کر کے ان کے آگے کھڑے ہیں اور یہ بے بنیاد وہم جن لوگوں نے تراش لیا تھا کہ موت سارے قصوں کو ختم کر دیتی ہے پا ئیں گے کہ یہ صرف ان کا وہم اور فقط ایک نفسیاتی دھوکہ تھا جواب دہی کی ذمہ داریوں سے گریز کا ایک خود ساختہ زبردستی کا حیلہ تھا۔

وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا۔

"اور پائیں گے جو کچھ انہوں نے کیا تھا سب ان کے سامنے حاضر ہے"

کے الفاظ میں اسی واقعہ کی اطلاع دیتے ہوئے قرآن نے اس سے بھی مطمئن کر دیا ہے کہ قدرتی نتائج عمل کرنے والوں کے سامنے جب آئیں گے تو وہ قدرتی نتائج ہی ہوں گے کمی و بیشی کی جن میں گنجائش ہی نہیں ہوتی۔

آدم علیہ السلام و شیطان کا قصہ اور اس کے نئے اجزاء:

"اور نہ ظلم کرے گا تیرا پروردگار کسی پر" کے فطری قانون کو ذکر کر کے اس سورۃ میں بھی آدم اور شیطان کے قصے کا اعادہ کرتے ہوئے جیسا کہ قرآن کا قاعدہ ہے اس خاص مقام کی مناسبت سے اسی قصے کے متعلق چند نئے اجزا کا تذکرہ کیا گیا جنہیں سورۂ کہف کے سوا اور ہم کہیں نہیں پاتے حالانکہ اس قصہ کو جیسا کہ معلوم ہے مختلف سورتوں میں اجزاء کی کمی و بیشی کے ساتھ قرآن میں بار بار دہرایا گیا ہے جہاں تک میرا خیال ہے قصہ کے یہی جدید عناصر جنہیں ہم یہاں پاتے ہیں خاص طور پر قابل توجہ ہیں اور ان ہی پر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ اس موقع پر اس قصہ کا اعادہ کیوں کیا گیا ہے۔

آدم اور شیطان کا قصہ تو مشہور ہی ہے یعنی فرشتوں کو جب آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو شیطان اکڑ گیا اور سجدہ کرنے سے اس نے انکار کیا۔ یہ حصہ قصہ کا تو یہاں بھی موجود ہے لیکن جدید عناصر جن کا اضافہ یہاں کیا گیا ہے میرے خیال کے مطابق وہ یہ ہیں۔

۱۔ شیطان "جن" کے طبقہ سے تعلق رکھتا تھا یعنی "کان من الجن" کا جو مفاد ہے۔

۲۔ شیطان تنہا نہیں ہے بلکہ اس کی ذریت (نسل یا بال بچے) بھی ہیں۔

قصے کے ان دونوں نئے اجزا کی طرف مفسرین کا ذہن بھی منتقل ہوا ہے اور بڑی طویل طویل دور از کار ❶ داستانوں میں لوگ مشغول ہو گئے لیکن ان دونوں سے بھی زیادہ توجہ کی مستحق جہاں تک میرا اندازہ ہے تیسری نئی بات جو یہاں پائی جاتی ہے اس کی طرف لوگوں کا دھیان شاید نہیں گیا۔ مطلب یہ ہے کہ عام طور پر آدم و شیطان کے قصے میں آدم کے مقابلے میں شیطان کی آزردگی کے ذکر کا پہلو غالب ہے حضرت آدم کی تحقیر اور اپنی برتری و بلندی پر اس نے اس موقع پر جو زور دیا تھا زیادہ تر اسی کو قرآن میں نمایاں کیا گیا ہے لیکن اس سورۃ میں بجائے اس کے سجدے کے حکم کے بعد:

فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّہٖ۔

"پس خدا کی بات کو پھاڑ کر شیطان نکل بھاگا۔"

کے الفاظ میں صرف شیطان کے طرز عمل کی تعبیر کی گئی ہے جس کا حاصل بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اپنے خالق کے حکم سے سرتابی کے جرم کا شیطان نے جو ارتکاب کیا تھا اور خدا کی بات سے لاپروائی اختیار کرتے ہوئے اپنے خود تراشیدہ خیالات اور اپنی رائے پر اسے اصرار تھا شیطان کے جرم کے اسی پہلو کی طرف اس خاص موقع پر قرآن خصوصیت کے ساتھ توجہ دلانا چاہتا ہے۔

---

❶ عجائب یہ ہے کہ ذریت اور نسل کے سلسلے میں شیطان کی دم تک کی جستجو لوگ کرنے لگے۔ امام شعبی جن کے مزاج میں ظرافت تھی صحابہ کے دیکھنے والوں میں ہیں ان کا لطیفہ مشہور ہے۔ کسی نے شیطان کی عورت (بیوی) کا نام پوچھا تو بولے اس بارات میں میں شریک نہ تھا کہ نکاح کے وقت نام سننے کا موقع ملتا۔ بعضوں نے تو یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ اپنی دم میں شیطان نے خود اپنے آپ کو حاملہ بنایا اور اسی ذریعے سے اس کی اولاد پیدا ہوئی۔

ان باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب غور کیجئے ان امور پر جو اس قصے کے بعد اس سورۃ میں پائے جاتے ہیں۔

شرک براہ غفلت:

واقعہ یہ ہے کہ اللہ کی یاد سے غافل بن جانے کے بعد شرک کی سی بیماری میں مبتلا ہونے سے تھا اپنی ساری کوششوں کو مادہ و شکم پروری کی درمیانی وقفہ والی زندگی ہی میں کھپا دینے کے اصول پر آج جو اصرار کر رہے ہیں ان کی اطاعت سے اہل ایمان کو قرآن نے جو منع کیا ہے بظاہر اس قصے سے اسی ممانعت کے وجوہ و اسباب کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ ایمان والوں اور مسلمانوں میں ان غافلوں کی ریس کی جو ہوک اٹھتی ہے اس کی بنیاد ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ غافلوں کا یہ گروہ بھی نظر آتا ہے کہ آدمیوں ہی کا گروہ ہے۔ آدمی جو دیکھ کر اس کے رنگ کو اگر آدمی اختیار کرے تو ہم جنسی کا یہ قدرتی تقاضا ہے لیکن ہم جنسی کے لئے صرف ظاہری شکل و صورت کا اشتراک کیا کافی ہے؟ آدم و شیطان کے قصے کے امتیازی اجزا جن کا خصوصیت کے ساتھ یہاں ذکر کیا گیا ہے ان سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ شیطان جو "جن" کے طبقے سے تعلق رکھتا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ باوجود جن ہونے کے صفاتی تبدیلیوں کی وجہ سے ملائکہ (فرشتوں) میں شریک ہو گیا تھا اس لئے اس حکم میں جو فرشتوں کو دیا گیا تھا وہ بھی شریک تھا۔ مگر اس کے بعد اپنے ملکی صفات و خصوصیات کو کھو بیٹھا اور خالق تعالیٰ کے حکم کے مقابلہ میں اپنی خود تراشیدہ رائے اور بافیدہ خیالات کا تابع بن گیا ہے اور جیسے صفاتی تبدیلیوں نے شیطان کو ملائکہ کی جماعت میں شریک کر دیا تھا اسی طرح بہت سے آدم زاد جو شکل و صورۃ آدم زاد معلوم ہوتے ہیں لیکن انہوں نے بھی خدا کی باتوں کو بے وزن ٹھہراتے ہوئے اپنی سوچی ہوئی باتوں سے علم و عمل کا نظام قائم کیا ظاہر ہے کہ وہ گو آدم کی اولاد ہونے کے باوجود صفاتاً وہ شیطان ہی کی ذریت اور نسل میں داخل ہو جاتے ہیں جیسے جنی شیطان صفات ہی کی وجہ سے کچھ دن کے لئے ملائکہ میں شریک ہو گیا تھا۔

اور یہ بھی سبق اس سے ملتا ہے کہ کائنات کی ابتداء و انتہا انسانی وجود کے مدعا وغیرہ سوالات

کے جواب کی تعلیم خود خالق کائنات کی طرف سے ہمیں حضرات رسل و انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ جو ملی ہے اور اسی کی بنیاد پر جس عملی زندگی کا مطالبہ ہم سے کیا گیا ہے اس کی بے وقعتی کرتے ہوئے جب اللہ کی یاد سے ان غافل قلوب کے تصورات و خیالات کے وزن کو ہم محسوس کرنے لگیں تو اس کا مطلب بھی تو ہوا کہ شیطان اور شیطان کی ذریت و نسل جو صورتاً و شکلاً آدمی معلوم ہوتے ہیں ان ہی کی ولایت اور نگرانی کو ہم قبول کر رہے ہیں۔

فرمایا گیا کہ جو دشمن ہیں محض صورت و شکل کے اشتراک کی وجہ سے ان ہی کو تم دوست بنا رہے ہو اور جو تمہارا خالق و مالک رزاق و رب ہے اس کی باتوں کو بے وقعت ٹھہرا رہے ہو۔

بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا۔

"(فطرت کے نقشِ زدہ حدود سے ہٹنے والے) ظالموں نے کتنا برا بدل اختیار کیا ہے۔"

کے الفاظ میں اسی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آگے سمجھایا گیا ہے اور کتنی واضح صاف معقول منطقی بات ان کے آگے رکھی گئی ہے کہ خالق کائنات کی باتوں کے مقابلہ میں ان منافق شیطانوں اور صوری انسانوں کی باتوں کے متعلق اپنے اندر غیر معمولی کشش اور وزن جو تم محسوس کر رہے ہو آخر اس کی بنیاد کیا ہے؟ جو فلسفہ یہ بگھارتے ہیں اور جس فلسفہ کی بنیاد پر عملی زندگی کا نظام انہوں نے قائم کیا ہے کیا اس فلسفہ کی بنیاد کسی علم پر قائم ہے فرمایا:

مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

"میں نے ان کو اس وقت اپنے سامنے بلا کر کھڑا نہیں کر لیا تھا جب آسمانوں اور زمین کی آفرینش ہو رہی تھی۔"

ظاہر ہے کہ اس وقت ان کا کیا' ان کے آباؤ اجداد کا بھی پتہ نہ تھا' خود آدم پیدا نہ ہوئے تھے۔ پھر جو کہتے ہیں کہ عالم کی ابتداء یوں ہوئی' پہلے یہ ہوا' وہ ہوا وغیرہ بجز لا ناتیات ❶ کے وہ اور بھی کچھ ہے؟

● لاناتیات میری ذاتی اصطلاح ہے مطلب یہ ہے کہ کائنات کی ابتداء و انتہاء وغیرہ جیسے امور جو قطعی طور پر انسانی حواس کی گرفت سے خارج ہیں ان ہی کے متعلق بجائے اعتراف جہل کے (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

اسی طرح عالم کے کاروبار سے حق تعالیٰ کو بے تعلق ٹھہراتے ہوئے جو یہ مدعی ہیں کہ اس سارے کاروبار کی باگ ہمارے قبضہ اقتدار میں ہے اور قدرت ان ہی کے بل بوتے پر دنیا کو چلا رہی ہے اطلاع دی گئی ہے کہ جو صرف یہی نہیں کہ بذات خود گمراہ ہیں بلکہ شیطان کی زینت بن کر دوسری قوموں کو سیدھی راہ سے بھٹکا کر گمراہ کر رہے ہیں ان ہی کو خدا کیا اپنا مددگار اور قوت بازو بنا سکتا ہے؟

مَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّينَ عَضُدًا۔

"اور گمراہ کرنے والوں کو میں نہیں ہوں قوت بازو بنانے والا"

کا کھلا ہوا مطلب یہی ہو سکتا ہے اور اسی لئے کہ اس موقع پر اسی ماڈرن شرک کا ذکر اوپر سے ہوتا چلا آ رہا ہے یہ خیال گزرتا ہے کہ آگے جو یہ فرمایا گیا ہے کہ ایک دن وہ بھی ہوگا جب ان سے کہا جائے گا کہ کائناتی کارفرمائیوں میں جن لوگوں کو میرا ساجھی اور شریک تم لوگ اپنے خیال میں ٹھہراتے تھے انہیں پکارو مگر ان کی طرف سے کوئی جواب پکارنے والوں کو نہیں ملے گا۔ اعلان کیا گیا ہے کہ اس دن موبق (ہلاکت کی وادی) کو اپنے اور شرکاء کے درمیان پائیں گے۔

خدا کے بجائے موجدین کی اہمیت:

ظاہر ہے کہ پوجا پاٹ والے شرک کے قدیم روایتی طریقہ میں جیسے بعض نادیدہ وہمی ہستیوں یا فرشتوں، جنوں، بھوتوں یا مرے ہوئے انسانوں کی روحوں وغیرہ کو مختلف ناموں سے موسوم کر کے عبادت و دعا، نذر و منت جیسی باتوں میں خدا کا شریک ٹھہرایا جاتا تھا یا اب بھی ٹھہرایا جاتا ہے، اسی طرح دنیا کے کاروبار میں خدائی کارفرمائیوں سے زیادہ اہمیت نیچر والے جدید ماڈرن شرک میں ان ہی لوگوں کو جو حاصل ہو جاتی ہے جو قدرتی قوانین کا علم حاصل کر کے نئے اختراعات اور جدید ایجادات و اکتشافات کو پیش کر رہے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ انسان سے باہر جو کچھ ہے سب کچھ خدا کا ہے اور عقل و خرد، حکمت و دانش کا سارا سرمایہ جو آدمی کے اندر ہے

(گزشتہ سے پیوستہ) محض شاعرانہ تخمینوں کے سہارے کسی قسم کا فیصلہ ایسی بات ہے کہ سر پر لحاف ڈال کر آدمی پڑ جائے اور وہ وہ سوسنہ جو دماغ میں آ جائے اسی کو واقعہ ٹھہرا لیا جائے۔ مابعد الطبعیات کے اکثر مسائل کی نوعیت یہی ہے اسی لئے ان مسائل کا نام ہی میں نے لایعنیات رکھ دیا ہے۔۱۲

جس کی مدد سے نت نئی ایجادیں اور حیرت انگیز مصنوعات دنیا میں پیش ہو رہے ہیں آدمی کے اندر کا یہ جوہر بھی اسی کا بخشا ہوا اور پیدا کیا ہوا ہے جو آدمی کا پیدا کرنے والا ہے مگر یہاں بھی یہی دیکھا جا رہا ہے کہ خدا جس کا سب کچھ ہے ان نئی ایجادوں کے متعلق اس کا نام لینے والا کوئی نہیں ہے لیکن جن کا کچھ نہ تھا ان ہی کے چرچوں سے دنیا گونج رہی ہے۔ جس کا پانی تھا آگ بھی آگ پر پانی جب چڑھا دیا جائے تو وہ اسٹیم (بخار) بن جائے گا جس نے یہ خاصیت ان چیزوں میں ودیعت فرمائی ہے اس کو سب بھولے ہوئے ہیں اور آب و آتش کے باہمی تعلق سے اسٹیم میں جو طاقت پیدا ہوتی ہے قدرت کے اس قانون کو پانے والے انجن کے پیش کرنے والے اسٹیفنسن کے ذکر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی زبان بھی نہیں تھکتی ہے اور ایک اسٹیفنسن ہی کیا آج اڈیسن، مارکونی جیسے موجدین اور نیوٹن آئنسٹائن جیسے اکتشافیوں کے افکار کے تصورات پیش کرنے والوں کا قلوب پر جو وزن چڑھا ہوا ہے اس کو دیکھتے ہوئے شاید یہ دعویٰ واقعہ کا اظہار ہوگا کہ خدا بھی تو ان کے شریک غالب ہیں۔ ان کا مرتبہ کسی طرح کم کی حیثیت سے جدید مشرکوں کے قلوب میں کم نہیں ہے اور جیسے لات و منات عزیٰ و ہبل شرک کے نظام قدیم کے شرکاء تھے ٹھیک والے شرک جدید میں یہی مقام آج ایجاد و اختراع تحقیق و اکتشاف کے ان سرغنوں کا ہے اس موقع پر قرآن میں۔

وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا۔

"اور دیکھا مجرمین نے آگ کو تب خیال کرنے لگے کہ اب تو اسی آگ میں ان کو (بہر حال) گرنا ہی ہے اور (بچنے کے لئے) اس سے بازگشت کی کوئی صورت وہ نہ پا سکے۔"

کا ایک انذار جو پیش کیا ہے خدا ہی جانتا ہے کہ پرانے جاہلی شرک کرنے والے شرکاء اور مشرکین کے سامنے زندگی کی کس منزل میں یہ تماشا بے نقاب ہوگا لیکن تعلیم یافتہ مشرکوں کے شرکاء کے لحاظ سے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ان کے سامنے شاید یہ صورت ہو چکی ہے پہلی جنگ عظیم کے بعد شرک جدید کے علاقوں میں یہی دیکھا جا رہا ہے کہ توڑا توڑ ایک مصیبت کے بعد دوسری مصیبتوں ایک آفت کے بعد دوسری آفتوں کا لامتناہی سلسلہ ہے جو شروع ہونے کے بعد

نظر اور طریقہ فکر اگر پیدا ہوا ہے اور قرآن میں ہم اس کے متعلق اشارات پڑھتے ہیں تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے بلکہ اتنا عظیم انقلابی طریقہ فکر جس کا تجزیہ شرک کی موجودہ عصری ذہنیت کر رہی ہے اس سے خاموشی عجیب بات ہے۔ ھذا القصہ قرآن جیسی اس آخری آسمانی کتاب کے لئے جس کے بعد کوئی کتاب اترنے والی نہیں تھی کیا حیرت ہو سکتی تھی کہ صرف "ما شاء اللہ لا قوۃ الا باللہ" کے چند لفظی فقرے میں آفاق وانفس (آدمی کے باہر اور آدمی کے اندر) کے متعلق جتنی استوار و محکم منطقی تعبیر میں حقیقت کا انکشاف کی گئی ہے کیا اس کے بعد اس تعلیمی شرک کا کوئی رنگ و ریشہ باقی رہ سکتا ہے؟ اسی لئے سوال ہوتا ہے کہ قرآت اور قرآن کے ان عظمت آفرین ایمان افروز بیانوں کی روشنی میں گو قدیم شرک کی دیواریں اس میں شک نہیں گر تو دی گئیں۔ نئے والوں کے اندر بھی مل چکی ہیں لیکن جدید شرک کے بازار کی رونق اگر بڑھ نہیں رہی ہے تو کم بھی نہیں ہوئی ہے اور سر دست اس کی کمی کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔

پھر اس کا انجام آخر کیا ہوگا؟ قرآنی ہدایت کی تیز و تند روشنی کے ہوتے ہوئے بھی دنیا اندھیرے میں ٹاک ٹوئیاں کیوں مار رہی ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ پہلے بھی دیکھا گیا ہے اور اب بھی دیکھا جا رہا ہے کہ حق کے مقابلہ میں جدلی منہ زوریوں سے کام لینے والے بالآخر تمسخر اور استہزاء پر اتر آتے ہیں اور استہزاء و تمسخر کا قدرتی نفسیاتی اثر ہے کہ حقائق و واقعات پر سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کے سلیقہ سے ایسے لوگ محروم ہو جاتے ہیں۔ ٹھٹھوں اور قہقہوں میں باتوں کے اڑا دینے کے عادی ہو گئے ہوں۔ کان رکھتے ہوئے وہ نہیں سنتے اور آنکھوں کے باوجود انہیں کچھ نہیں سوجھتا۔ اسی موقع پر یہ اطلاع دیتے ہوئے۔

وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا۔

"انہوں نے میری آیتوں کو اور جن باتوں سے ان کو چونکا دیا گیا (سب کو) مذاق اور تمسخر بنا لیا۔

تغافل کا نتیجہ:

ان مسخروں کے ظلم اور خدا کی باتوں سے ان کی لاپروائیوں کا تذکرہ کر کے پھر قرآن میں

فرمایا گیا ہے:

إِنَّا جَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَن يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا۔

"قرآن کو وہ سمجھیں (اس معاملہ میں) ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ ٹھونس دی ہے"

بظاہر انسانی نفسیات کے اسی باطنی مہلک عارضہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ عجیب مرض ہے قاعدہ ہے کہ استہزائی خفقان کا دورہ جب کسی پر پڑتا ہے تو قلم اور زبان دونوں سے اس دورے کے ایام میں دیکھا جاتا ہے کہ پھبتے ہوئے چست فقرے بے ساختہ نکل رہے ہیں اپنی طباعی اور غیر معمولی ذہانت کے دھوکے میں غریب گرفتار اسی کی وجہ سے خود بھی مبتلا ہو جاتا ہے اور تمام کاروں کی طرف سے داد و تحسین کا سیلاب جب امنڈتا ہے تو دوسروں کو بھی وہ وقت کا مجتہد نظر آتا ہے اور خود اپنے متعلق بھی بیچارہ اسی فریب کا شکار ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً اس باطنی اور نفسیاتی مرض کی زنجیریں کستی ہی چلی جاتی ہیں وہ سمجھتا ہے کہ میں نکل رہا ہوں حالانکہ اور زیادہ دھنستا چلا جاتا ہے۔ یہ بڑی خطرناک ذہنی کیفیت ہے۔ "قبولِ حق" کی گنجائش ان حالات میں تقریباً سلب ہو جاتی ہے اور علاج کی کوئی صورت اس کے سوا باقی نہیں رہتی جس کا ذکر یہاں بایں الفاظ فرمایا گیا ہے۔

قدرتی گرفت کی دو شکلیں:

إِلَّا أَن تَأْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ ❶ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا۔

"یہ کہ پہلوں کا طریقہ ان کے سامنے آئے یا قسط وار عذاب ان کے آگے آئے۔"

قدرتی مواخذہ کی مستقل شکلوں کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے سنۃ الاولین (پہلوں کا طریقہ) اس کا مطلب وہی ہے جو عام مفسرین نے لکھا ہے کہ جیسے گزشتہ دنوں الماضی اقوام اور امتوں کا کلی صفایا کر دیا گیا۔ اولین کی تاریخی سنت کے نمونوں کی بکثرت مثالیں

❶ سنة الاولين هو عذاب الاستيصال "او يأتيهم العذاب قبلاً" بضم القاف والباء جميعاً وهو جمع قبيل بمعنى ضروب من العذاب تتواصل" امام رازی نے مذکورہ بالا الفاظ میں تفسیر کی ہے اور راغب نے بھی مفردات میں "قبلا" کی یہی شرح کی ہے۔

خود قرآن میں موجود ہیں اور دوسری شکل اس اجتماعی مواخذہ کی ہے کہ بتدریج مختلف مصائب و آلام کی ایک قسط کے بعد دوسری قسط کا نشانہ ان کو بنایا جاتا ہے تاآنکہ بالآخر غارت و نابود ہو کر اس قسم کی مجرم قوم میں شاید ہمارے زمانے کے رجائی فکر اور ان کی پیدا کی ہوئی طغیانیوں کے ساتھ مواخذہ کی دوسری صورت کا ظہور شروع ہو چکا ہے اور جب شروع ہوا ہے تو بہر حال انجام تک پہنچ کر رہے گا۔

اور سچ پوچھئے تو ارحم الراحمین کی رحمت عامہ اور اس کی صفت غفوریت کے تقاضوں کے یہ کرشمے ہیں کہ گرفت میں قدرت کی طرف سے بجائے عجلت کے تاخیر و تمہیل سے کام لیا جا رہا ہے اور میرا کوئی ذوقی احساس یا صوفیانہ حسن ظن ہی نہیں ہے بلکہ

وَإِنْ تَدْعُهُمْ إِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا إِذًا أَبَدًا۔

"اور اب اگر تو ان کو 'الہدیٰ' کی طرف بلائے گا بھی تو وہ کبھی راہ پر نہیں لگ سکتے۔"

کے فیصلہ کن اعلان کے ساتھ قرآن ہی میں یہ فرمانے کے بعد

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ۔ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ۔

"اور تیرا بہت بڑا بخشنے والا رب رحمت والا ہے جو کچھ انہوں نے کیا اگر ان کو اس پر پکڑ لے تو عذاب کو ان پر فوراً لے آئے۔"

یہ اعلان کیا گیا ہے۔

بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا۔

"بلکہ ان کی گرفت کے لئے ایک خاص وقت کا وعدہ ہے ہرگز نہ پائیں گے اس سے کوئی پناہ کی جگہ۔"

ظاہر ہے کہ جن کے متعلق قطعی فیصلہ کی صورت میں حق تعالیٰ کی طرف سے یہ اطلاع دی گئی ہو کہ وہ راہ پر نہیں لگ سکتے اور ہدایت نہیں پا سکتے ان ہی کے متعلق یہ خیال کرنا کہ یہ وہ مغفرت کی گنجائش پیدا کرنے کے لئے ان کو ڈھیل دی جا رہی ہے کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا بلکہ گرفت میں عدم تعجیل حق تعالیٰ کی اسی رحمت عامہ کا تقاضا ہے جس سے کوئی محروم نہیں ہے اور اسی کی اسی

رحمت واسعہ کا یہ نتیجہ ہے کہ مغفوریت یعنی گناہوں کے نتائج کو دبا دینے کی اپنی صفت سے ان کو بھی مستفید ہونے کا موقع عطا کیا جاتا ہے جن کو توبہ اور بازگشت کی توفیق کبھی میسر آئے گی۔ لیکن خدا کی مغفوریت ان کی شرارتوں اور نافرمانیوں کے نتائج کو کب تک اور زندگی کی کن کن منزلوں میں دبائے رکھے گی۔ اس کا صحیح علم تو خدا ہی کے پاس ہے بایں ہمہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ نیکوکاروں اور بدکاروں مجرمین و غیر مجرمین دونوں کو برابر کر دیا جائے۔ اس لئے بہر حال خدا کے انصاف اور عدل کے تقاضے بھی پورے ہوں گے اور وہی موعد (وعدہ کا وقت و مقام خاص) ہے۔ جس منزل پر پہنچنے کے بعد فرماں برداروں، طاعت شعاروں کا انجام دیکھا جائے گا کہ نافرمانوں اور باغیوں کے انجام سے جدا قطعاً جدا ہو گیا جو کچھ آپ کے سامنے آ گیا وہ اس سے قطعاً مختلف تھا جس سے دوسرے طبقہ کو دوچار ہونا پڑا۔ اسی کے بعد جو کہ:

وَتِلْكَ الْقُرَى أَهْلَكْنَاهُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَوْعِدًا۔

"اور یہ بستیاں تباہ کر دیا جنہیں ہم نے جب انہوں نے ظلم کیا اور ان کی تباہی کے لئے بھی موعد (وعدہ کا خاص زمانہ) ہم نے مقرر کیا تھا۔"

کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں جن سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ موعد اور وعدے کا تعلق ہر ایک شخص کی انفرادی زندگی سے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کے سامنے اپنی انفرادی زندگی کے نتائج بہر حال آ کر رہیں گے ان نتائج سے بچ کر نکل بھاگنے میں "موئل" پایا جائے پناہ کی تلاش کرنے میں کوئی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ انفرادی زندگی کے ان نتائج کے ظہور کا حقیقی مقام مستقل دوامی زندگی کی وہ منزل ہے جس میں موجودہ عبوری گزشتنی وگزاشتنی دور کے بعد قوم کی اولاد داخل ہوگی۔

ایک لخت عذاب:

پچھلی قوموں کے اجتماعی جرائم سے متعلق کچھ دیر پہلے آپ سن چکے کہ قرآن مجید میں موعدہ اور گرفت کی دو شکلیں بتائی گئی ہیں۔ ایک سنۃ الاولین (اگلوں کا طریقہ) جس کا مطلب جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے یہ ہے کہ اچانک ان پر ایسا عذاب آ جاتا ہے جس کے بعد اس قوم کا کلی

صفایا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہو جاتا ہے عرض کر چکا ہوں کہ اولین (اگلوں) کی اس سنت (طریقہ) کے تاریخی نمونوں اور مثالوں کے ذکر سے قرآن معمور ہے قوم نوح عاد ثمود ایکہ وغیرہ وغیرہ کی گرفت قدرت کی طرف سے اسی رنگ میں ہوئی اور اجتماعی مواخذہ کی دوسری شکل وہ ہے جسے "او یاتیھم العذاب قبلا" (یا آئے عذاب ان پر قسط وار تھوڑا تھوڑا کر کے) کے الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ جس فقرے سے سورۂ کہف کا تعلق ہے میں نے کہا تھا کہ اس فتنہ کی طغیانیوں کے مقابلہ میں مواخذہ اور گرفت کی اسی دوسری شکل کی ابتداء بظاہر ہو چکی ہے اور یہ دوسرا فقرہ جس میں ظالم قوتوں کی تباہ شدہ آبادیوں کی طرف اشارہ کر کے قرآن نے جس "مہلک" یعنی پیش آنے والے ہلاکت خیزیوں کی دھمکی دی ہے اور اطلاع دی ہے کہ اس کا بھی ایک موعد (وعید کا وقت) مقرر ہے۔ اس کا تعلق آخری زندگی والے مواخذے کے مقابلہ میں اجتماعی زندگی کی اس گرفت اور مواخذے سے ہے جس کا ظہور زمین کے اس کرہ پر ہونے والا ہے۔ آخر میں یہ پوچھتا ہوں کہ ظالموں کی جن برباد شدہ اجڑی ہوئی بستیوں کی طرف عبرت حاصل کرنے کے لئے قرآن نے یہاں اشارہ کیا ہے۔ یہ بستیاں جب زمین کے اسی خاکی کرہ پر برباد ہوئیں تو اس فقرے میں جس "مہلک" یا ہلاکت خیزیوں کی خبر دی گئی ہے اس کے متعلق اس کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ حادثہ بھی خاک دان ارضی ہی پر پیش آنے گا۔

قسط وار عذاب:

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ بجائے سنۃ الاولین کے قبلا (قسط وار) ہی کی شکل میں مہلک کی یہ وعید پوری ہوئی اور عذاب کی جن قسطوں کا آغاز ہو چکا ہے بہرحال وہ انجام تک پہنچ کر ہی رہے گا اور کون کہہ سکتا ہے کہ اسی سورۂ کہف کی ابتدائی آیات میں جس من لدنی عذاب شدید کی دھمکی دیتے ہوئے خبر دی گئی ہے کہ ما علی الارض (زمین پر جو کچھ ہے سب کو) میں صعیدا جرزا (چٹیل اجاڑ میدان) بنا دینے والا ہوں ان ابتدائی باتوں کا سورۃ کے آخری اجزاء سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

چنانچہ جو کچھ اب تک دکھایا جا چکا ہے۔ قرآنی پیشگوئیوں کے سمجھنے اور سمجھانے کیلئے وہی کافی ہے

باب ششم

موسیٰ و خضر علیہما السلام، ذوالقرنین اور یاجوج و ماجوج

(۱) قصہ موسیٰ و خضر علیہما السلام

اب ہمارے سامنے پہلے بعد دیگرے سورۂ کہف کے وہ دونوں قصے آتے ہیں جن میں ایک قصہ موسیٰ و خضر علیہما السلام کے عنوان سے مشہور ہے اور دوسرا قصہ ذوالقرنین نامی عہد ماضی کے کسی حکمران کا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہی دونوں قصے تیا سارے قرآنی قصص اس آخری آسمانی کتاب میں پائے جاتے ہیں ان سے العیاذ باللہ محض داستان سرائی یا قصہ خوانی تو مقصود ہے اور نہ کبھی ایسا سمجھا گیا ہے۔ پہلے بھی مانا گیا ہے اور آج تک یہی مانا جاتا ہے کہ ان قصوں کے پیرایہ میں پڑھنے والوں کو اسرار و حکم کے اسباق، عبرت و بصیرت کے درس پڑھائے گئے ہیں، گویا حدیث دیگراں کے لباس میں "دلبری کے اسرار" کو فاش کیا گیا ہے۔ اسی مسلمہ نقطہ نظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سوچنا چاہیے کہ جس خاص مقام و محل پر ان قصوں کو ہم پاتے ہیں اس کے لحاظ سے کن نتائج تک ان دونوں قصوں سے ہم پہنچ سکتے ہیں اور ان سے اپنی عملی زندگی میں کس حد تک مستفید ہو سکتے ہیں؟

قصہ کا ماحصل:

پہلا ماجرا جو سمجھا جاتا ہے کہ حضرت خضر اور موسیٰ علیہما السلام کے درمیان پیش آیا تھا۔ اس کا خلاصہ اگر نکالا جائے تو شاید یہی ہو سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام سے جو یہ خواہش کی تھی:

هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَن تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا.

"کیا میں آپ کے ساتھ اس غرض سے چل سکتا ہوں کہ رشد (یعنی سوجھ بوجھ) کی جو باتیں آپ کو سکھائی گئی ہیں وہ آپ مجھے بھی سکھا دیں۔"

مطلب جس کا بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وقت کے تقاضوں کے تحت رشد یا سوجھ بوجھ کے

کسی خاص سلیقہ کی ضرورت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے محسوس کی اور اس کے لئے خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو رشد اور سوجھ بوجھ کے ان پہلوؤں سے متعلق گویا ایک قسم کا عملی درس دینا چاہا جن کے وہ خواہش مند تھے۔

پہلا عملی درس:

کشتی والے نمونے سے جیسا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے خود ہی تصریحاً کی ہے بتانا اور سمجھانا مقصود تھا کہ ایسے مواقع بھی کبھی پیش آ جاتے ہیں جن میں ظالم کو اس کی ظالمانہ چیرہ دستیوں سے ہٹانے کے در پے ہونا وقت کے اقتضاء کے مطابق نہیں ہوتا بلکہ ایسے زمانہ میں مصلحت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ ظالم اپنی ظالمانہ کارروائیوں کا نشانہ جس چیز کو بنانا چاہتا ہو اسی میں بظاہر کچھ ایسے نقائص اور عیوب چاہیے کہ عمداً اور قصداً پیدا کر دیئے جائیں جن کی وجہ سے ظالم کے حرص و آز کی نگاہوں سے تو وہ چیز گر کر اس کے سامنے سے ہٹ جائے لیکن بذات خود وہ شے بھی باقی رہ جائے اور جو کام اس سے نکل رہا ہو اس میں خلل پیدا نہ ہو۔

الغرض ظالم کو ظلم سے ہٹانے کی گنجائش جہاں نہ معلوم ہوتی ہو تو اس وقت یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز پر اپنے (ظلم و تعدی) کی مشق ظالم کرنا چاہتا ہو اسی کو ظالم کے سامنے سے ہٹا دیا جائے خواہ اس کی وجہ سے کچھ عیب اور نقص ہی کا نقصان مظلوموں کو کیوں نہ برداشت کرنا پڑے۔ اور یہ بھی عقل کی کہی بات کہ کلیۃً جس چیز سے محرومی کا خطرہ جہاں محسوس ہو رہا ہو وہاں نقص اور عیب ہی کے ساتھ کیوں نہ ہو خود اس چیز کا بچ جانا اسی کو غنیمت خیال کرنا چاہیے۔ شگاف یافتہ ہی سہی لیکن غریب ملاحوں کی وہ کشتی بچ تو گئی اور ملاحوں کا کام بھی اس سے نکلتا رہا۔ حالانکہ خرق اور شگاف کا عیب اگر اس میں نہ پیدا کر دیا جاتا تو دریا کے اس پار کا ظالم حکمران غریب ملاحوں سے زبردستی چھین کر ہمیشہ کے لئے اس کشتی اور کشتی کے اور منافع سے ان کو محروم کر دیتا۔

دوسرا عملی درس:

اس کے بعد دوسرا عملی درس حضرت خضر علیہ السلام نے غلام یا اس کے صاحبزادے کو ختم کر

کے دیا جس کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دریافت فرمانے پر کہ ایسی شخصیت جو اندورنی گندگیوں سے پاک بھی تھی (نفس زکیہ کے الفاظ سے ان کی یہی مراد تھی) اور اس بے چارے نے کسی کی جان بھی نہ ماری تھی اس کی گردن پلا وجہ آپ نے کیوں اتار دی؟ یعنی یہ تھا۔

اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً ۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ۔

"آپ نے قتل کر دیا ایک پاک (زکیہ) نفس کو کسی جان کے بدلے کے بغیر"

اس موسوی اعتراض کا جواب دیتے ہوئے حضرت خضر علیہ السلام نے ان کے سامنے جس حقیقت کا انکشاف فرمایا تھا اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ دوسری بات یعنی اس نے کسی کی جان نہیں ماری تھی' اس الزام سے تو شاید وہ بری تھا لیکن پاک باطن اور نفس زکیہ ہونے کا دعویٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے متعلق جو کیا تھا' اسی غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے خضر علیہ السلام نے اس واقعہ سے موسیٰ علیہ السلام کو مطلع کیا کہ پیدا تو ہوا تھا مومن والدین سے یعنی ایمان والی خاتون کی گود میں اس کی پرورش ہوئی تھی اور نشوونما بھی اس کی ہوئی تھی ایک مومن باپ ہی کے زیر سایہ' دودھ بھی پیتا تھا اسی نے اسی مومنہ ماں کا' اور عقل و شعور ہوش و حواس کے درجے تک بھی پہنچا تھا اپنے مومن باپ کی دستگیریوں ہی سے' اسی کی انگلیاں پکڑ کر سن تمیز و رشد کے پانے میں کامیاب ہوا تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ ایسے اسباب پیش آئے اور کسی ایسے ماحول میں جا کر پھنس گیا کہ بجائے احترام و تعظیم کے اس کے اندر طغیان اور سرکشی کے جذبات والدین کے مقابلے میں ابھرتے ہوئے ترقی کر کے اس حد تک پہنچ گئے کہ مومن والدین کا یہ بچہ کفر یعنی ارتداد کے جرم تک کا مجرم بن گیا اور اپنے طغیان و سرکشی' کفر و ارتداد کا وبال ڈال کر اپنے ان مومن والدین کو بھی پریشان کر رہا تھا یا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ آئندہ پریشان نہ کرے۔ حاصل جس کا یہی ہوا کہ اخلاقی اور اعتقادی غلاظتوں میں وہ لت پت تھا اور مستحق ہو چکا تھا کہ اس کے عدم کو اس کے وجود پر ترجیح دے دی جائے۔ قصاص یعنی قتل کے جرم میں تو قاتل کو اس لئے قتل کیا جاتا ہے کہ دوسروں کو آئندہ اس جرم کی جرأت نہ ہو لیکن اپنی اخلاقی و اعتقادی گندگیوں میں کرتے ہوئے جو یہاں تک پہنچ گیا ہو کہ اور تو اور والدین جنہوں نے اس کو پوسا پالا تھا ان کے لئے اس کا وجود صرف خطرہ بن کر رہ گیا ہو۔ کسی ایمانی گھرانے کے لئے ماؤف عضو کا علاج

سے بڑھاپے میں اپنی معذوری سے بچنے کا ذریعہ ہونے کے قریب تر ہے گا۔ ان رشتہ داروں میں ظاہر
ہے کہ سب سے پہلے بیٹے والدین ہی کو داخل سمجھا جانا چاہیے۔ یہاں مفسرین نے صرف والدین
کے ساتھ حسن سلوک کے تقاضات کو اس بیٹے کے متعلق کما حقہ ذکر کیا ہے بظاہر اس کی کوئی وجہ
سمجھ میں نہیں آتی۔ قرآن میں خصوصیت سے اس بات کی تصریح کے لئے کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔
اس لئے سمجھنا چاہیے کہ عام رشتہ داروں میں والدین کے ساتھ بھائی بہن اور کنبے کے دوسرے
لوگ بھی شریک ہیں۔ آگے حضرت خضر علیہ السلام کے عملی درس کے اس حصے سے جس نتیجہ
پیدا کرنے کے اہم تقاضے والے ہیں اس کے لئے اقرب رحما کے الفاظ کی یہ تشریح نظر میں اہمیت
رکھتی ہے۔ پڑھنے والوں کو چاہیے کہ اسی سے اس کی عملی اہمیت کو محسوس کریں۔

تیسرا عملی درس:

باقی تیسرا عملی نمونہ حضرت خضر علیہ السلام نے اس آبادی میں پیش کیا تھا جس کے
باشندوں نے ان دونوں بزرگوں (موسیٰ و خضر) کی درخواست پر بھی مہمان بنانا منظور نہ کیا
اور یک لخت کہہ دیا اپنے دروازے سے ان کو دھتکار کر صرف یہی نہیں کہ مہمانی کی تکلیف بچائی
بلکہ ان کی توہین بھی کی گئی پایا یہ کہ اس آبادی کی ایک دیوار جو گرا ہی چاہتی تھی جھکی
ہوئی تھی۔ اور مزدوروں کے ذریعہ خضر علیہ السلام نے اس کو درست فرما دیا اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا۔

"اگر تم چاہتے تو اس کی مزدوری لے سکتے تھے۔"

کے الفاظ کے ساتھ گویا ان پر اعتراض کیا تو جواب میں حضرت خضر علیہ السلام نے یہ فرمایا
کہ اس آبادی کے دو یتیم بچوں کا موروثی کنز (خزانہ) اس دیوار کے نیچے دبا ہے۔ ان بچوں کا
باپ صالح اور نیک آدمی تھا حق تعالیٰ نے یہ چاہا کہ اس نیک آدمی کے ان یتیم بچوں تک یہ سرمایہ
اس وقت پہنچے جب وہ بلوغ کو پہنچ جانے والے ہو جائیں اور اس وقت اپنے باپ کے موروثی مال
سے مستفید ہوں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان بچوں میں اپنے موروثی کنز سے استفادہ کی پوری صلاحیت جب تک نہ

پیدا ہو جائے" حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ مردِ صالح کے متروکہ مال کی حفاظت کا انتظام میرا فرض تھا جسے میں نے انجام دیا خواہ جس آبادی کے یہ بچے تھے وہاں کے باشندوں نے میرے ساتھ کیسا ہی برا سلوک کیا ہو اس لئے اس فرض کی انجام دہی میں مزدوری اور اجر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' وہ ہمیں مہمان رکھتے یا نہ رکھتے بہر حال اپنا فرض مجھے انجام دینا چاہئے تھا۔ یہی سبق ہے جو حضرت خضر علیہ السلام نے اپنے تیسرے عملی نمونے سے دیا۔

بہر حال خضری درس کے تینوں عملی نمونوں کا قرآن میں جن الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے' اپنے الفاظ میں میں نے اسی کا حاصل پیش کیا ہے جو عربی جانتے ہیں وہ اصل قرآنی آیات سے اور عربی نہ جاننے والے ترجمے سے اس خلاصے کو مقابلہ کر کے دیکھ سکتے ہیں اس کے بعد اب میں ان پانچ نتائج اور عبرت و بصیرت کے ان اسباق کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جن کی طرف میرا خیال اس قصے سے منتقل ہوا ہے۔

عرض کر چکا ہوں کہ مجرموں کے مواخذہ اور گرفت میں بجائے عجلت اور جلد بازی کے قدرت تاخیر اور ڈھیل سے کیوں کام لیتی ہے' اس کے اسباب و وجوہ کو بیان کرتے ہوئے آخر میں جو یہ اعلان کیا گیا تھا۔

بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا۔

"بلکہ (ان کی پکڑ کے لئے) جس وقت کا وعدہ کیا گیا ہے جب وہ وقت آ جائے گا تو اس سے بچنے کی جگہ نہ پائیں گے"

مطلب جس کا یہی تھا کہ الحاد و بے دینی کا موجودہ دجالی فتنہ جو اسی دین کے شکم سے پھوٹ کر نکل پڑا ہے جس کی بنیاد ولدیت (یعنی مسیح ابن مریم خالق کائنات کے بیٹے ہیں) کے افترائی و انتساب بے معنی عقیدے پر قائم کی گئی تھی' اس قصے کے دردناک انجام کی جو خبر دی گئی ہے اور "من لدنی باس شدید" (عالم اسباب سے بالاتر سخت ترین جنگ) جس کی بدولت بالآخر زمین اور اس کا سارا بناؤ سنگھار "صعید جرز" (اجاڑ میدان) کی شکل اختیار کر لے گا۔ یہ انجام اور قدرت کا یہ جہاں سوز انتقام آئے گا تو بہر حال' لیکن کب آئے گا؟ اس وقت کو کوئی معین نہیں کر سکتا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس کے لئے کس وقت کا وعدہ کیا گیا ہے اور اس کا موعد کیا ہے۔

حاصل جس کا یہی تھا کہ خاتم المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جن علوم و معارف کی وحی ہوئی ان ہی کی تلاوت اور ان ہی پر اپنی زندگی کو منطبق کرنے کی کوششوں میں ان رفقاء کے ساتھ مشغول رہنا جن کے متعلق اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ:

يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ.

"پکارتے رہتے ہیں اپنے رب کو صبح و شام اور مراد رکھتے ہوئے ہیں اسی کے چہرے کو۔"

اور دوسری بات وہی جس کا حکم:

قُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ.

"بول اسی سچائی کو جو تیرے رب سے تجھ تک پہنچی ہے، پھر جس کا جی چاہے مانے، جس کا جی چاہے نہ مانے۔"

کے الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔

دجالی فتنہ کے پیش نظر ہندوستان قدیم میں دینی مدرسوں کا قیام عین بصیرت پر مبنی تھا

بظاہر دیکھنے میں کہفی زندگی کے یہ مشاغل آسان ہی کیوں نہ نظر آتے ہوں لیکن فتنے کے جن دنوں میں ان مشاغل کا مکلف ان لوگوں کو بنایا گیا ہے جو ایمان اور عمل صالح کی زندگی کے ساتھ جینا بھی چاہتے ہیں اور اسی پر مرنا بھی چاہتے ہیں۔ تجربہ اور مشاہدہ بتا رہا ہے کہ حالات نے اس آسان زندگی کو بھی حد سے زیادہ دشوار بنا دیا ہے اور کچھ نہیں اس فتنے کی ان ہی تین نمایاں خصوصیتوں کو سوچئے جن کی طرف مذکورہ بالا سطروں میں اشارہ کیا گیا ہے۔ دور کیوں جایئے بطور مثال آپ کے سامنے اس کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں کہ جب یورپ و امریکہ سے موجودہ دجالی فتنہ کا سیلاب مشرق کی طرف امنڈا اور اس کے روح کش ایمان ربا تھپیڑوں کی زد میں شاید سب سے پہلے ہمارا ملک ہندوستان ہی آیا اور مسلمانوں کی حکومت اس ملک میں تہہ و

بالا ہوگئی۔ چاہنے والوں نے پہلے تو یہی چاہا کہ ظلم ہی کا ازالہ کیا جائے لیکن تجربے نے بتایا کہ
عالم کے بجھنے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ تب کہیں زندگی کے ذکر و بالا مشاغل کے لئے دینی مدارس کا
انتظام ملک کے مختلف گوشوں میں قائم کیا گیا اور ایسے زمانے میں قائم کیا گیا جب اسی ہندوستان میں
یورپ کے علوم جدیدہ کی تعلیم کے لئے ملک کے طول و عرض میں سکولوں اور کالجوں کا جال مختلف
یونیورسٹیوں کے تحت بچھایا جا رہا تھا۔ ان جدید جامعات اور کلیات و مدارس کے طویل و عریض
ایوانوں کے مقابلے میں غریب عربی مدارس کی جو حیثیت تھی وہ تو ظاہر تھی ہی، ماسوا اس کے عربی کی
ان تعلیم گاہوں کے قیام میں نہ اخباروں میں پروپیگنڈے سے کام لیا گیا نہ پبلسٹی کی دنیا میں
ہلچل پیدا کی گئی دیواروں اور نمایاں مقامات پر نہ لمبے چوڑے پوسٹر آویزاں اور چسپاں کئے گئے
نہ شہروں اور قصبوں میں کانفرنسوں اور سالانہ اجتماعات کے تماشوں کا نظم کیا گیا نہ ان کے لئے اپنا
خاص لٹریچر تیار کیا گیا بلکہ انتہائی کس مپرسی کے حالات میں گمنام قصبوں اور دیہاتوں کی مسجدوں
کے گوشوں میں کچھ پڑھنے والے اور پڑھانے والے سمٹ گئے تھے تعلیمی نصاب نقائص و عیوب
سے معمور تھا نہ عصری تقاضوں کے مطابق علوم و فنون کی کتابیں اس میں شریک تھیں اور نہ دنیا کی
موجودہ مختلف زبانوں میں سے کسی زبان کو اس نصاب میں جگہ دی گئی۔ مَآ اُوْحِيَ إِلَيْكَ مِنْ
كِتَابِ رَبِّكَ (یعنی محمد رسول اللہ ﷺ پر جن علوم کی وحی کی گئی تھی) ان کے ساتھ عہد قدیم کے
بعض قدیم فرسودہ فنون کی کتابیں اور وہ بھی انتہائی بے دلی کے ساتھ ان عربی مدرسوں میں
پڑھائی جاتی تھیں۔ الغرض ظاہر ہو یا باطن اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ ان مدارس میں شگاف
ہی شگاف اور خرق ہی خرق دیکھنے والی آنکھوں کو نظر آرہے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اور شاید اب
تک ہے کہ یورپ و امریکہ جیسے ترقی یافتہ ممالک والوں تک ہی نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ خود
ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ان سے یا کم از کم ان کی قدر و قیمت سے ناآشنا ہی رہا ❶

❶ اس دلچسپ لطیفہ کو میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ جامعہ عثمانیہ کے پرو وائس چانسلر (نائب امیر جامعہ) مرحوم قاضی محمد حسین صاحب بھی کیمبرج رہ چکے تھے قاضیوں کے خاندان سے کوئی تعلق تھا اس لئے قاضی کا لفظ اپنے نام کے ساتھ لازماً لکھا کرتے تھے پنجاب کے رہنے والے تھے ہندوستانی یونیورسٹی کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد یورپ گئے اور ریاضی میں رینگلر کی ڈگری حاصل کی۔ ملاقاتوں میں چند ہی (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

میں دوسروں کے متعلق کیا کہوں، اپنے دینی مدارس کی ان شکستہ حالیوں اور پڑھنے پڑھانے والوں کی شکستہ بالیوں، ان کی کس مپرسیوں، ناقدریوں کو دیکھ دیکھ کر خود میرا جی بھی ہمیشہ کڑھتا رہا اور جو عیوب ونقائص ان میں ہیں ان کو میں اب بھی عیوب ونقائص ہی سمجھتا ہوں لیکن چپکے کھلے دماغ کے ساتھ ان کوتاہیوں کا مجھے اعتراف ہے، اسی کے ساتھ اس واقعہ اور مشاہدہ کا بھی کیسے انکار کروں کہ ہمارے ان مدارس کے جن شگافوں اور کوتاہیوں کو دیکھ دیکھ کر بہی خواہوں کی طرف سے نوحہ خوانیوں اور ماتم سرائیوں کا سلسلہ اس قسم کے الفاظ وتعبیروں میں جاری تھا کہا جاتا تھا کہ یہاں سے پڑھ پڑھ کر نکلنے والے

نہ سرکار میں کام پانے کے قابل | نہ دربار میں لب ہلانے کے قابل
نہ بازار میں بوجھ اٹھانے کے قابل | نہ جنگل میں ریوڑ چرانے کے قابل

اور اسی لئے بعض فیصلہ کرنے والوں نے فیصلہ تک کر دیا تھا کہ

بس لوٹ دو بساط کہ یاں مات ہو چکی | ان سے تو اب تلافی مافات ہو چکی

جہاں تک میرا خیال ہے بجائے معاندانہ تعریضوں، رقیبانہ طنز اور طعنوں کے اس قسم کی تنقیدوں کی نوعیت بھی اگر وہی قرار دی جائے جو موسیٰ علیہ السلام کے اس اعتراض کی تھی۔ جب کشتی کے شگاف اور خرق کو دیکھ کر انہوں نے خضر علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

أَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا إِمْرًا۔

''کیا تم نے کشتی میں شگاف اس لئے پیدا کر دیا کہ کشتی والوں کو ڈبو دو تم نے بڑا نامناسب کام کیا۔''

(گزشتہ سے پیوستہ) افراد نے یہ امتیازی ڈگری اور وہ بھی ریاضی جیسے فن میں حاصل کی تھی کہنا یہ ہے کہ بسا اوقات سلسلۂ ذکر میں دیوبند کے مدرسہ کا نام جب آتا تو قاضی صاحب انتہائی معصومیت کے ساتھ پوچھا کرتے کہ مولانا! یہ مدرسہ پنجاب میں شاید اس جگہ ہے جہاں نمک کے پہاڑ ہیں؟ کہتے کہ ہاں ہاں بچپن میں ایک دفعہ اس جگہ میں گیا بھی تھا۔ میں نے کئی دفعہ ان کو تصحیح بھی کی لیکن حافظہ کی سخت جانی کی وجہ سے نمک کے پہاڑ کا مسئلہ ان کے دماغ سے نہ نکلا۔ حالانکہ وہ بچارے صرف مسلمان دوست ہی نہیں اسلام دوست آدمی بھی تھے۔ غفرالله له۔

لیکن جو جاننے والے جانتے ہیں کہ مذکورہ بالا عیوب و نقائص سے پاک کر کے ان مدارس کو بھی عصری جامعات اور کلیات کے مطابق اگر بنا دیا جاتا اور جن صلاحیتوں کے فقدان کا مرثیہ ان کے متعلق پڑھا جا رہا تھا! اگر ان صلاحیتوں کے پیدا کرنے کا سامان بھی کر دیا جاتا تو دینی تعلیم کے پچھلے تاریک و تار دنوں میں یہی بچی کھچی نجات کی کچھ کشتیاں ان لوگوں کو جو میسر آتی رہی ہیں جو ایمان و عمل صالح کی زندگی کے ساتھ قبر کے کناروں تک پہنچنے میں اب تک کامیاب ہوتے ہیں کیا ہم نجات کی کشتیوں کو پا سکتے تھے؟ یہ ان ہی کسمپرس دینی مدارس کا طفیل ہے کہ اسلامی حکمرانوں کے چند ایسے افراد کی دینی تربیت و پرداخت کا موقع مل گیا جو سرفرازی اور سربلندی کے عصری سامانوں سے اگر لیس ہوتے تو بجائے پرانے قصبات کی اجڑی ہوئی مسجدوں، سوتی خانقاہوں کے۔ سنتے کہ لندن کے انڈیا آفس اور پارلیمان میں وہ نظر آتے۔ کم از کم ہندوستان کی اسمبلیوں، کونسلوں، ہائی کورٹوں کی زیب و زینت بن کر وہ ختم ہو جاتے۔

بلکہ تجربہ یہ بھی بتا رہا ہے کہ دین کے جن مدارس میں وقت کے تقاضوں کی رعایت کی گئی حکومت کی نگاہوں میں وہ چڑھ گئے پھر ان کے مختاری کر دینے کا ارادہ کیا گیا یا ان کو بھی اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنا لیا گیا۔ چلو تو وہ رہے ہیں اب بھی دینی مدارس ہی کے نام سے لیکن جاننے والے ہی جانتے ہیں کہ ان مدارس سے فارغ ہونے والے کام کس کے آ رہے ہیں۔ یہ سامنے کے واقعات اور مشاہدات ہیں ہر دیکھنے والی آنکھ ان نتائج کو دیکھ رہی ہے اور اس وقت سمجھ میں آتا ہے کہ کہنی رنگ کے دینی مدارس کے عزم صفت بانیوں نے خرق و شقاق کے ان عیوب و نقائص کو ذہن میں کن مصلحتوں کے تحت باقی رکھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مسلمان ماؤں کے بچوں کو ان کی گودوں سے چھین چھین کر عصری جامعات اور یونیورسٹیوں میں داخل کر کے مغربیت و سرکشی، الحاد و ارتداد کے کافرانہ جراثیم ان کے دل و دماغ میں ایک طرف پرورش کرنے والے پرورش کر رہے ❶ تھے تو دوسری طرف ان کے مقابلے میں ہمارے یہی کھلی مدارس تھے جنہوں نے مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کے ایک طبقے کو خواہ ان کی تعداد جتنی بھی

❶ ڈاکٹر اقبال مرحوم ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چلاتے رہتے تھے مسلمانوں کو چونکاتے تھے کہ:

الحذر از عصر دورِ زنگار ۔ گیر فرزندان خود را در کنار

کم ہوا اعتقادی و اخلاقی گندگیوں سے پاک رکھنے کی کامیاب کوشش کی۔ میں قلبی طہارت و تزکیہ و پاکیزگی کا مدعی نہیں ہوں لیکن دنیا ہمہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ کبھی سلسلہ کی تعلیم گاہوں میں تعلیم پڑھنے والوں میں ایسے افراد کم ہی پیدا ہوتے رہتے ہیں جو قرآنی الفاظ خیر امتہ زکوۃ (بہتر ہو اس سے (اعتقادی اور اخلاقی) پاکیزگی میں) کے مصداق بن سکتے ہیں یعنی اعتقادی و اخلاقی پاکیزگی جیسی چاہئے اس کے وہ مالک ہوں یا نہ ہوں لیکن فتنہ زدہ دجالی یونیورسٹیوں کے طلبانیوں کی اکثریت کے مقابلہ میں نسبتاً اضافی پاکیزگی کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اور گو معاشی نقطہ نظر سے جدید تعلیم گاہوں کے پڑھنے والوں کی حالت بظاہر بہتر ہی کیوں نہ نظر آتی ہو لیکن دین کے متعلق ان کی کافی تعداد نے اپنے طرز عمل سے خود یہ ثابت کر کے دکھایا کہ اسلام کے لئے ان کا عدم ان کے وجود سے بہتر تھا جس قسم کے شکوک و شبہات کی چنگاریاں عام مسلمانوں میں ان کی طرف سے اڑائی گئیں اسلامی عقائد و اعمال کی تحقیر و توہین کے سلسلہ میں جن گستاخیوں اور ناکردنیوں کے وہ مرتکب ہوئے خود ان ہی نے ان کو اس فیصلہ کا مستحق بنا دیا کہ اسلام کے ان کپوت فرزندوں کی ہستی ان کی نیستی سے یقیناً بہتر تھی بلکہ اس بدل بچے کے متعلق حضرت خضر علیہ السلام نے اپنے عمل کی جو تشریح و توجیہ کرتے ہوئے اقرب رحما کے الفاظ جو فرمائے تھے مطلب جن کا بیان کرتا ہوں کہ رحمی رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک رحم و کرم محبت و الفت کے برتاؤ میں اس رشتے کے اقتضاؤں سے بچے کے دور ہونے کے وہ قریب تر ہوگا میرا خیال ہے تو ان الفاظ سے ذہن ادھر بھی منتقل ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب کہ نئی زندگی کی تعلیم گاہوں کی بظاہر فراخیابیوں سے تعلیم پانے والوں کو یہ جو نظر آتا ہے کہ نسبتاً محروم کر دیتی ہے شاید اس محرومی سے محفوظ رہنے کی کل تدبیر کی طرف ممکن ہے ان الفاظ سے اشارہ کیا گیا ہو۔

تعلیم جدید کا ایک عمومی اثر:

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تعلیم جدید کا ایک عمومی اثر اور عام نتیجہ جو یہ نظر آتا ہے کہ ماں باپ کی امداد سے اپنے آپ کو بے نیاز پانے کے ساتھ ہی ان سے بھی اور جن جن سے یہ رشتہ والدین کے توسط سے قائم ہوا تھا سب ہی کو ٹھوکر مار کر دیکھا جا رہا ہے کہ الگ ہو جاتے ہیں اور ان کے

اعصابی انعام پر عموماً عورت یعنی بیوی ہی سوار ہو جاتی ہے۔ بظاہر تو وہ سمجھتے ہیں کہ بڑے پورے ہو چکے ہو گئے لیکن ہوئے "ناقہ سوار محمل" کے جب کسی "مرد سوار محمل" کے ہاتھوں میں ان کا معاشی نظم آ جاتا ہے، تجربہ آپ کو بتائے گا کہ اس کے بعد ہر فراغت ان کے لئے تنگی ہی تنگی بنتی جائے گی۔ نسوانی خواہشوں کے بے تھاہ سمندر میں زر و قربانی بھی ❶ کبھی تیر کیڑے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ آخر چونکایا کے معتق کی قیمت بھی جہاں ہزاروں سے متجاوز ہوتی ہو وہاں اس کے سوا خود سوچیے کہ اور امکان ہی کس چیز کا ہے؟ اس راستہ پر جو بھی پڑ گیا ایک ایسی راہ پر چل پڑا ہے جس کا نہ اور ہے نہ چھور، لیکن یہی ہے کہ ان کے تھوڑی تھوڑی آمدنی رکھنے والے ایک ہی ماں باپ کے چند بھائی جب ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرتے ہیں یعنی "اقرب رحما" کی قرآنی روشنی میں معاشی زندگی کو منظم کرنے کا موقع خوش قسمتی سے جن کو مل جاتا ہے تو تجربہ ہی آپ کو بتائے گا تھوڑی آمدنی بھی کیسے عجیب و غریب طریقے سے بڑی سے بڑی آمدنی سے حاصل ہونے والی مسرتیں کو ان کے قدموں پر نچھاور کرتی ہے! اخلاص و محبت کی یہ خاندانی زندگی کیسے آڑے وقتوں اور کٹھن گھڑیوں میں مشکل کشائی کے معجزوں کے ساتھ سامنے آتی ہے!

بہرحال مجھے تو جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے "اقرب رحما" کے الفاظ میں ان معاشی نقصانات کی تلافی کی ایک مخفی سی تدبیر پوشیدہ نظر آتی ہے لیکن کیا کیا جائے کہ "کھلی مدارس" کے طلبہ بھی بتدریج تمدن زدہ معاشرت کی مسموم ہواؤں سے متاثر ہوتے چلے جا رہے ہیں اور بھی رشتہ کے تقاضوں سے زیادہ ان پر بھی ازدواجی رشتہ ہی کی گرفت سخت سے سخت تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یقیناً ایسی صورت میں اپنی معاشی بدحالی کے وہ خود ذمہ دار ٹھہرائے جائیں گے۔

اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام نے اجر و مزد کے خیال سے بالاتر تعمیر دیوار کا جو عملی نمونہ اس آبادی میں پیش کیا تھا، جس کے باشندوں نے ان کی تحقیر و توہین انتہائی حدود تک پہنچا دی تھا۔ آپ چاہیں تو ان ہی "کھلی مدارس" میں جمود و بیانی ختم کے استیلا و تسلط کے بعد اس ملک میں

---

❶ تیرہ سو کی قیمت والی مشہور مچھلی۔

بجائے نام کی ان دو صفات یعنی:

اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۔

"دے رکھا تھا اپنے پاس سے ہم نے اسے رحمت اور سکھایا تھا ہم نے اپنے حضور سے اس کو علم"

سے جس شخصیت کو روشناس کرایا گیا ہے ان کا نام کیا تھا؟ واقعہ کی تحقیق کے لحاظ سے علم تاریخ کا تو یہ مسئلہ ہو سکتا ہے لیکن قرآن جس کام کے لئے نازل ہوا ہے شاید اس مقصد کے لئے ان تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں' ضرورت ہوتی تو یقیناً قرآن ہی میں ان کو واضح کر دیا جاتا' تاہم صحیح بخاری کی مشہور روایت جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد صحابہ و تابعین میں یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ یہ موسیٰ کون تھے؟ حضرت ابی بن کعب کے حوالے سے ابن عباس نے بیان کیا کہ بنی اسرائیل والے موسیٰ بن عمران تھے۔ بہر حال قرآنی الفاظ کے رو سے سوچنے کی بات اگر ہو سکتی ہے تو یہ دونوں فقرے ہو سکتے ہیں جن کے ذریعے سے بتایا گیا ہے کہ جس شخص کی ملاقات سے بلیغ جستجو اور پختہ عزم کے بعد موسیٰ علیہ السلام کامیاب ہوئے تھے ان کی ذات ایک نہیں بلکہ دو مستقل کمالات اور خوبیوں کی جامع تھی۔ دوسری بات یعنی "علمنه من لدنا علما" کا مطلب تو ظاہر ہے کہ حسی و عقلی ذرائع کے سوا براہ راست علم و آگہی کی روشنی حق تعالیٰ کی طرف سے ان کے سینے میں چمکتی رہتی تھی' اور اسی روشنی میں بعض مخفی حقائق جن کا علم صرف عقل و حواس کے ذریعے نہیں ہو سکتا تھا' ان سے واقف ہو جاتے تھے۔ یقیناً ان کے عملی درس کے عملی نمونوں میں بھی اس علم لدنی کی شہادتیں مل رہی ہیں' لیکن دریافت طلب پہلا فقرہ "اتیناه رحمة من عندنا" کا ہے۔ ہم نے اپنے پاس سے اس کو رحمت عطا کی تھی۔ یہ تو اس کا ترجمہ ہوا لیکن مطلب کیا ہے۔ صحاح کی مشہور حدیث:

ان الله تعالىٰ مائة رحمة فمنها رحمة يتراحم الخلق بينهم (مسلم)

"اللہ تعالیٰ کی رحمت کو سو حصوں پر مشتمل سمجھا جائے تو ان میں سے صرف ایک حصہ رحمت کا ہے (جو مخلوق کو ملا ہے) اسی کی وجہ سے ایک مخلوق دوسری مخلوق پر رحم کرتی ہے"۔

یہ یا اسی کے قریب قریب دوسرے الفاظ میں جس واقعہ کا اظہار روایتوں میں کیا گیا ہے' اس

ہوئے سمندر کی طرف چلی گئی۔ موسیٰ علیہ السلام آگے بڑھ چکے تھے واپس لوٹے۔

تو جو لوگ ایسے ہوا لے بعض قرآنی الفاظ پر حصر کر کے واقعاتی نوعیت کو ترجیح قرار دیتا تو جیسے کہ میں نے عرض کیا ان پر یہ الزام تو ضرور عائد ہوگا کہ صحیح حدیث کی خلاف ورزی کر رہے ہیں لیکن یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ قرآنی بیان کی بھی ان کی عقل نے پیروی کی۔

ایک اشتباہ:

رہا تصوف کا وہ طبقہ جو شریعت کے حدود کو پھاند کر بیٹھ ❶ یہاں تشریف ہونے کے لیے خضر و موسیٰ کے قصے۔ سے نقش اٹھانا چاہتا ہے میرے نزدیک قرآن کے سیاق و سباق سے اس کے بنیاد نتیجے کا کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا اور واقعے سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ کوئی کائنات یعنی عالم کے بعض حوادث کا علم حضرت خضر علیہ السلام کو ہو جاتا تھا لیکن یہ بات کہ جس شریعت کی اس رسول پر حق تعالیٰ نے فرمائی ہے اس شریعت میں بھی رد و بدل کا اختیار اس نظیر کی بنیاد پر ان لوگوں کو ہو جاتا ہے جن پر وحی نہیں ہوتی ان کے لیے اس واقعہ سے سند پیش کرنا بہت ہی غلط جسارت ہے۔

(۴) قصہ ذوالقرنین:

اب میں پھر اصل قرآنی سیاق کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ فتنے کے عبوری دور میں لیگی زندگی سے متعلق پیدا ہونے والے مشکلات کے حل کو جیسے حضرت موسیٰ اور خضر والے قصے میں ہم پاتے ہیں یا پا سکتے ہیں اسی طرح ایک قدرتی سوال اس کے بعد یہ سامنے آ جاتا ہے کہ خود اس فتنے کی عمر جس قدر بھی دراز و طویل ہو لیکن بہرحال اس کا دور تو ختم ہوگا اور قدرت کی گرفت و انتقام کا وعدہ (مقرر وقت) اس کے سامنے آ ہی کر رہے گا۔

ایسی صورت میں یہ کھلا ہوا بدیہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ فتنے کے اختتام کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ دنیا کے نظم و ضبط کی باگ آ سکتی ان کو اس وقت کیا کرنا چاہیے۔

اب آپ اپنے سامنے رکھیے اس سوال کو اور پڑھئے اسی کے ساتھ ذوالقرنین کے قصے کو

❶ انسانوں کا وہ طبقہ جو کسی آئین و قانون کی پابندی کو قبول نہیں کرتا۔

لیکن ظاہر ہے کہ آدمی دماغ کے ساتھ دل بھی اور جسم کے ساتھ روح بھی رکھتا ہے۔ اور بلا شبہ انسانیت کے ان اہم عناصر کی صحت و توانائی کی طرف بھی حکومتوں کو توجہ کرنا چاہئے لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں انتہائی ترقی یافتہ حکومتوں میں بھی یہ سوال اب تک نہیں اٹھایا گیا ہے بلکہ مذہب و دین وغیرہ کے نام سے کچھ چیزوں کی طرف مبہم مبہم سا اشارہ کر کے چھوڑ دیا گیا ہے کہ اس قسم کی باتیں انسان کی شخصی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں حکومتوں کو ان میں دخل نہ دینا چاہئے۔

لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ دماغ کے ساتھ "دل یا قلب" بھی وجود انسانی کا ایسا "قیمتی جوہر" ہے جو انسانی اخلاق و کردار کا بنیادی سرچشمہ ہے اور جب تک دیدھا، شک، وسوسے جیسے عام امراض کے مقابلہ میں یقین و اذعان اور استقامت کی پختگی دلوں میں پیدا نہیں ہوتی، نہ اخلاقی نظام ہی درست ہو سکتا ہے اور نہ کرداری۔ کیا استحکام کی توقع ہو سکتی ہے

بہرحال ہم دیکھتے ہیں کہ سفر کے پہلے مرحلہ میں ذوالقرنین جن لوگوں میں پہنچے ہیں ان کے متعلق سب سے پہلے اسی فرض کی طرف جس سے دنیا کی موجودہ ترقی یافتہ حکومتیں بھی محروم ہیں ان الفاظ میں ان کو توجہ دلائی گئی ہے پوچھا گیا تھا کہ۔

"اے ذوالقرنین! تم ان لوگوں کو سزا دینا چاہتے ہو یا نیکی کا برتاؤ ان کے ساتھ کرو گے۔" یعنی

قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا۔

کا جو خلاصہ ہے پھر یہ جواب ان کو سمجھایا گیا کہ:

"ان میں (اپنے حدود) سے جو تجاوز کریں گے ان کو (یہاں تو) میں سزا دوں گا پھر وہ اپنے مالک کے پاس جب واپس جائیں گے تو ناقابل تصور عذاب سے دوچار ہوں گے لیکن یقین و ایمان والوں اور نیک کردار لوگوں کے لئے بہترین معاوضہ ہے اور میری طرف سے آسانیاں ان کے لئے پیش ہوں گی۔"

یہی حاصل ہے ان قرآنی الفاظ کا جو ذوالقرنین کی طرف منسوب کئے گئے ہیں یعنی

قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا۝ وَ اَمَّا

مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨالْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ۔

اسی طرح سفر کے اس تیسرے مرحلے کے متعلق یہ اطلاع دی گئی ہے کہ دونوں پہاڑوں کے درمیان والی سرزمین کے باشندوں کی ذہنی پستی انحطاط کے اس درجہ تک پہنچی ہوئی تھی کہ جانوروں میں جیسے یہ دیکھا جاتا ہے کہ گو وہ دیکھتے سنتے چلتے پھرتے بھی ہیں لیکن اسی کے ساتھ افہام وتفہیم اور مخاطبت کو قبول کرنے کی گویا ان میں صلاحیت نہیں ہوتی اور ان سے جو کچھ کہا جائے تو اسے نہیں سمجھتے تقریباً یہی ذہنی حال ان دونوں پہاڑوں کے بیچ میں رہنے والے باشندوں کا معلوم ہوتا ہے قرآن میں اس اقوام کی اس خصوصیت کا اظہار

لا یکادون یفقہون قولا

"نہ قریب تھے اس کے کہ بات سمجھیں۔"

کے الفاظ سے جو کیا گیا ہے یہ خصوصیت ظاہر ہے کہ اسی وقت تک خصوصیت باقی رہ سکتی ہے جب ان الفاظ کا وہی مطلب سمجھا جائے جو فقیر کے ذہن میں آیا ہے ورنہ محض زبان کی ناواقفیت کا نتیجہ اس کو اگر قرار دیا جائے تو ظاہر ہے کہ اس میں اس قوم کی کیا خصوصیت ہے بولنے والے کی زبان سے جو بھی ناواقف ہوتا ہے، ان کی گفتگو نہیں سمجھتا خواہ تہذیب وتمدن کے بلند ترین مقام ہی پر کیوں نہ ہو۔

بہرحال مذکورہ بالا الفاظ میں ان کے ذہنی انحطاط وپستی کا ذکر کر کے آگے جو باتیں اس قوم کے متعلق بیان کی گئی ہیں ان سے میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے واللہ اعلم بالصواب

کہ ذوالقرنین کی حکومت نے ان کی دماغی تربیت وہدایت کی طرف توجہ کی اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ یاجوج وماجوج نامی قوم ان غریبوں کے علاقہ میں آ کر فتنہ وفساد کے ہنگامے جو مچاتی رہتی تھی اس کے مقابلہ میں اپنی مظلومیت کا احساس بھی ان میں زندہ ہوا اور ان کے مظالم سے نجات پانے کی خواہش بھی ان میں پیدا ہوئی۔ جس کے لئے ذوالقرنین کی حکومت سے امداد کے وہ طالب ہوئے۔ پھر حیرت ہوتی ہے کہ جو حیوانوں سے اپنی ذہنی پستی کے لحاظ سے بمشکل ممتاز تھے ان ہی کے آگے ذوالقرنین کی طرف سے ایسی فرمائشیں پیش ہو رہی ہیں جن کی تعمیل

عظمت، سائنس کی علمی و عملی مہارت کے بغیر ناممکن ہے۔

آخر خود سوچئے کہ لوہے تانبے جیسی دھاتوں کو پہاڑوں کے اندر سے برآمد کرنا اور آلائشوں سے پاک کر کے چادروں اور تختوں کی قالب میں ڈھالنا یا اسی قسم کی باتوں کی قدرت غیر معمولی دماغی تربیت اور عملی مشق و مہارت کے بغیر کیا پیدا ہو سکتی ہے؟ آپ ذوالقرنین کے اس قصہ میں غور کیجئے کہ قرآن خود اطلاع دے رہا ہے کہ دونوں پہاڑوں کے درمیان رہنے والی قوم نے جب یاجوج و ماجوج کے مفسدانہ حرکات کی شکایت کی اور ان کی حکومت سے دستگیری کے متوقع ہوئے تو ان سے ذوالقرنین نے

اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ

"لوہے کی تختیاں میرے لئے مہیا کرو"

کی بھی فرمائش کی اور

اٰتُوْنِیْۤ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قِطْرًا

"اور آؤ پگھلا دیں اس پر پگھلے ہوئے تانبے کو"

کا حکم بھی دیا تھا اور یہ ساری چیزیں ذوالقرنین کی خدمت میں ان کی فرمائش کے مطابق اسی قوم کی طرف سے پیش کر دی گئیں۔ پھر یہی نہیں بلکہ جب دونوں پہاڑوں کے بیچ میں اپنی مشہور تاریخی دیوار (سد) کی تعمیر کا فیصلہ ذوالقرنین نے کیا تو اس عجیب و غریب سائنٹیفک تعمیر میں منجملہ اور باتوں کے اس قوم کی عملی خدمات سے بھی فائدہ اٹھایا گیا تھا خصوصاً جب گرم کر کے لوہے کی تختیوں کو چاہا گیا کہ دہکا کر ان کو گویا آگ ہی بنا دیا جائے تو اتنی طویل و عریض دیوار کی آہنی تختیوں کو جو اینٹوں کی طرح تہ بہ تہ ایک دوسرے پر نیچے سے اوپر تک جمادی گئی تھیں ان کو ہوا دے کر تپانے اور گویا آگ بنا دینے کا کام قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی قوم کے ان ماہروں نے انجام دیا جو اس کام میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے قرآنی الفاظ

قَالَ انْفُخُوْا حَتّٰۤی اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا

"ذوالقرنین نے کہا کہ پھونکو تا آنکہ بنا دیا اس آہنی دیوار کو آگ۔"

سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے پھر اس کارروائی کے بعد تہ بہ تہ جمائی ہوئی ان آہنی اینٹوں

کے متعلق یہ ارادہ کیا گیا کہ بجائے مٹی یا اینٹ وغیرہ کے قطر (پگھلے ہوئے تانبے) کے گارے سے ان کو جوڑا جائے تاکہ بنی ہوئی اس دیوار کو پیچھے سے اوپر تک آگ ہی آگ ہو جس کی ہر ایک اینٹ تک پگھلے ہوئے تانبے کو پہنچایا۔ میرے نزدیک تو اب بھی نا قابل تصور سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن جس واقعہ کو ہم سوچ بھی نہیں سکتے قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی خاص حکیمانہ اور سائنٹفک تدبیروں سے کام لے کر اسی کو کر کے انہوں نے دکھایا۔ بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ '' اتونی افرغ علیه قطرا (لاؤ میں اس پر قطر (پگھلے ہوئے تانبے) کو انڈیل دوں) مذکورہ بالا قرآنی الفاظ کا اقتضا بظاہر یہی ہے کہ اس حیرت انگیز عمل میں بھی ذوالقرنین نے ان لوگوں کی عملی چابک دستیوں سے استفادہ کیا تھا۔

قصے کے نتائج یعنی فرائض حکومت:

بہر حال میں تو اسی مذکورہ بالا وجوہ کی بنیاد پر اس نتیجے تک پہنچا ہوں کہ سفر کے پہلے مرحلے میں جیسے ذوالقرنین نے ان لوگوں کے تعب اور رنج کی تحقیق و تصفیہ کو اپنی حکومت کا فرض قرار دیا تھا یہی کام حق تعالیٰ نے ان کے ذمہ کر دیا تھا۔ اسی طرح سفر کے تیسرے مرحلہ میں اپنی رعایا کو ذہنی و دماغی پستیوں سے ابھار کر اپنی حکومت کا فریضہ قرار دے کر ان میں ایسی غیر معمولی عقلی و عملی صلاحیتیں پیدا کر دیں کہ آج بھی ہم جب ان کو سوچتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے۔ اب جو سفر کے درمیانی مرحلہ میں ذوالقرنین کی رسائی جب اس مقام پر ہوئی

جہاں انہوں نے آفتاب کو دیکھا کہ

تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا۔

'' طلوع ہو رہا ہے ایک ایسی قوم پر جن کے اور آفتاب کے درمیان ہم نے کوئی اوٹ نہ رکھی تھی۔''

تو آگے صرف یہ فرماتے ہوئے کہ:

كَذٰلِكَ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا۔

'' یوں ہی ہے اور جو کچھ بھی ذوالقرنین کے آگے پیش آیا تھا ہم واقفیت کے لحاظ سے

اس پر حاوی تھے۔"

اس مرحلہ کا تذکرہ ختم کر دیا گیا ہے۔

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ پہلے اور تیسرے مرحلہ میں جن لوگوں سے ذوالقرنین ملے تھے وہ ذوالقرنین کی امداد کے محتاج تھے' قلب و روح کی اصلاح کی ضرورت جن کو تھی ان کی بھی ضرورت پوری کی گئی اور دماغی و ذہنی پستی کے جو شکار تھے ان کی ان کمزوریوں کا علاج بھی کیا گیا لیکن درمیانی مرحلے کے ملنے والے غالباً اس قسم کے نقائص سے پاک تھے اسی لئے ان کے متعلق ذوالقرنین کے خدمات کا تذکرہ قرآن میں نہیں کیا گیا۔

اور ان کی خصوصیت کا اظہار جن الفاظ میں کیا گیا ہے یعنی یہ کہ آفتاب جس وقت طلوع ہوتا تھا اس وقت ان کے اور آفتاب کے درمیان کسی قسم کا اوٹ نہ تھا۔ ان الفاظ سے میری سمجھ میں کچھ ایسا آتا ہے کہ یہ حالت صرف طلوع آفتاب کے وقت تک محدود تھی' ورنہ یہ احتمال کہ نہ وہ مکانوں ہی میں رہتے تھے اور نہ کسی قسم کا لباس پہنتے تھے بلکہ ان کی ساری زندگی کھلے میدانوں میں ننگے بدن گزرتی تھی۔ اسی لئے ان کے اور آفتاب کے درمیان کسی قسم کا کوئی پردہ نہ تھا' کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے' وحشی سے وحشی قومیں بھی کم از کم دھوپ' بارش' سردی' گرمی وغیرہ سے بچنے کے لئے مصنوعی مکانوں میں نہ سہی لیکن غاروں اور قدرتی گڑھوں میں پناہ لیتی ہیں۔ اسی طرح سوت اور اون کے بنے ہوئے کپڑے نہ سہی مگر چمڑوں یا چھوب ہی سے بدن کو ڈھانکتی ہیں۔

بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس حال کو صرف اس خاص وقت کے ساتھ اگر محدود سمجھا جائے جس وقت آفتاب طلوع ہوتا ہے اور یہ قرار دیا جائے کہ ان کے مکانات کی تعمیر اس طریقہ پر ہوئی تھی کہ طلوع کے وقت کی شعاعوں سے مستفید ہونے کا موقع ان کو بھی اور ان کے گھروں کو بھی روزانہ میسر آتا تھا تو قطع نظر اس کے اس قسم کے تعمیری سکیم بعید از عقل بھی نہیں ہے ہم اس سے اگر اس نتیجہ تک پہنچیں کہ قدرتی قوانین سے استفادہ کے سلسلہ میں اس قوم کا شعور کافی روشن اور بیدار ہو چکا تھا وہ جسمانی صحت کے گر سے بھی واقف تھے اور جسمانی صحت کا اثر دماغی اور قلبی صحت پر کیا اور کس حد تک پڑتا ہے اس کا بھی عملی تجربہ ان لوگوں کو تھا اور شاید اسی وجہ سے

ذوالقرنین کی خدمات کی ضرورت ان کو نہ ہوئی تو قرآنی الفاظ میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس ذہنی انتقال کے لئے گنجائش ضرور پائی جاتی ہے خواہ یہ گنجائش کسی وجہ کی ہو بلکہ اسی مقام پر پہنچ کر جسمانی و دماغی و قلبی صحت مندیوں کے جو غیر متوقع نمونے ذوالقرنین کے سامنے پیش ہوئے تھے ہوسکتا ہے کہ قد احطنا بما لدیہ خبرا۔ (اور ہم حاوی تھے واقفیت کے لحاظ سے ان باتوں پر جو ذوالقرنین کے سامنے پیش آئی تھی) کے الفاظ سے ممکن ہے کہ ان ہی کی طرف اشارہ ہو۔

بہرحال یہ بھی جو کچھ عرض کیا گیا ہے صرف ایک ذہنی انتقال ہے ❶ قرآنی الفاظ کا یہی حقیقی مطلب اور مراد ہے اس کا دعویٰ نہ کیا گیا ہے اور نہ کیا جاسکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس سلسلہ میں صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ سفر کے درمیانی مرحلہ میں ذوالقرنین کی کسی خدمت اور کام کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ذوالقرنین کے اس قصے سے حکمرانی کے متعلق چند اہم بنیادی اصول کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔ سمجھنے والے اگر سمجھنا چاہیں تو حکومت کے فرائض میں اس قصے کی روشنی میں ایسے فرائض کو بھی پا سکتے ہیں جنہیں بہتر سے بہتر ترقی یافتہ حکومتوں کی فہرست فرائض میں ہم نہیں پاتے۔

پھر ذوالقرنین کی مساعی سے جب تاریخی دیوار تیار ہوگئی تو قرآن میں ہے کہ اس دیوار کی طرف اشارہ کر کے ذوالقرنین نے کہا تھا۔

هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ

❶ ذہنی انتقال کا مطلب یہی ہے جس کا ذکر ثبوت ان حدیثوں سے ملتا ہے جن میں آیا ہے کہ بعض دفعہ کسی تعبیر سے تو رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے لیکن فال نیک اور شگون کی بھی جس کی ممانعت نہیں فرمائی گئی بلکہ اسی بنا پر جہاد میں فرماتے تھے کہ کوئی آپ کو بتاتا تو فرماتے کہ اللہ تعالیٰ معاملہ کو سہل اور آسان کریں گے اس کی متعدد مثالیں حدیثوں میں ملتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ سہل جس کا نام رکھا گیا تھا مر گئے۔ ان کی مراد یہ تھا ہی کہ کیا کسی مہم میں سہولت ہوگی بلکہ اس نام کے ساتھ حسن ظن جو حاصل ہے کے لئے رسول اللہ ﷺ کا ذہن مبارک اس کی طرف منتقل ہوا۔ ورنہ مر گئے۔ ان کی مراد تو اس لفظ سے اس شخص کی ذات تھی جس کا نام اسی سے سہل رکھا تھا۔

مگر ان کی خدمت میں پیش کرتے ہیں مگر ان کی طرف سے انہیں جواب ملا

مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ

"میرے رب نے (جن چیزوں پر) مجھے قابو دے رکھا ہے وہ تو میرے لئے بہتر ہے"

جس کے معنی یہ ہیں کہ اس خرچ (ٹیکس) کو ذوالقرنین نے ان لوگوں پر لاگو بھی منظور نہ کیا بلکہ ان کی دستگیری کے لئے ان کی حکومت جو کچھ کر سکتی تھی اس کو اپنی طرف سے خود ان کی کے آگے پیش کرتے ہوئے ان سے صرف ان ہی چیزوں کا مطالبہ کیا جو ذوالقرنین کے پاس غالباً تھیں یا ہو سکیں تو اس کام کے لئے کافی نہ ہو سکتی تھیں جن کی ضرورت تھی۔

ان تمام کے سوا قصے میں زبر حدید (آہنی تختیاں) قطر (مس گداختہ) اور جو خدمت جس طریقے سے بھی ان سے لئے گئے ان کو بھی پیش نظر رکھتے ہوئے قصے کی ابتدا میں

وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا

"دے رکھے تھے ہم نے ذوالقرنین کو (حکومت کے متعلق) ہر پہلو کے لحاظ سے ذرائع"

کے الفاظ سے جو اطلاع دی گئی ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کے قیام و بقاء وارتقاء کے لئے جن جن امور کی ضرورت ہوتی ہے یہ ساری باتیں ذوالقرنین کو حاصل تھیں بعض مفسرین نے تو ان ہی قرآنی الفاظ کی روشنی میں یہ بیان کرتے ہوئے کہ

كل ما يتوصل به الى المقصود من علم و قدرة او آلة (تفسیر ابوالسعود سورہ کہف)

"اسی سلسلہ میں یہاں تک لکھ دیا کہ انه سخر له السحاب (یعنی بادل بھی ذوالقرنین کے قابو میں کر دیئے گئے تھے) واللہ اعلم اس کا کیا مطلب ہے۔"

خیر مجھے یہ کہنا ہے کہ ایسے مصنوعات و آلات جن کی تیاری میں حکمت و سائنس کے اکتشافات و تجربات سے امداد حاصل کی گئی ہو۔ ذوالقرنین کے قصے کے ان اشاروں سے یقیناً اس کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے کہ حکومت کے استحکام و استواری اور ترقی کے لئے ان سے استفادہ میں دینی نقطۂ نظر سے کسی قسم کا کوئی حرج نہیں ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآنی منشاء کی تکمیل کی یہ ایک

ذوالقرنین سکندر رومی نہیں:

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بدقسمتی سے عام مسلمانوں میں جو یہ غلط بات مشہور ہوگئی ہے کہ ذوالقرنین مقدونیہ والا رومی اسکندر تھا اس بے بنیاد افواہ سے تو مذکورہ بالا دونوں احتمالات ایک گونہ مستحق توجہ ہو سکتے ہیں لیکن پھر بھی فقیر کا ذاتی احساس یہی ہے کہ ان احتمالات میں سے کسی احتمال کی تعیین یا کسی جدید احتمال کو پیدا کرنا تاریخ کا مسئلہ تو ہو سکتا اور ممکن ہے مورخ کے لئے یہ دلچسپ تاریخی مشغلہ ہو لیکن قرآنی مطالب واغراض کے سمجھنے اور ان سے مستفید ہونے کے لئے تاریخ کے فیصلوں کا نہ ہم انتظار کر سکتے ہیں اور نہ قرآن کی شان کے مناسب یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قرآن فہمی کے لئے ہمیں مورخوں کے فیصلہ کا منتظر بنایا گیا ہو۔

بہر حال جب خود ذوالقرنین ہی کی شخصیت کے متعین کرنے کی ضرورت قرآن فہمی کے سلسلہ میں غیر ضروری ہے تو ان ہی کے متعلق اس قسم کے ذیلی سوالات کہ پورب پچھم کے جن علاقوں کی طرف گئے وہ کون سے علاقے تھے؟ دونوں پہاڑوں کے بیچ کی سرزمین والی قوم دنیا کے کن دو پہاڑوں کے درمیان رہتی تھی؟ بند یا سد جو ان دونوں پہاڑوں کے درمیان باندھا گیا' ذوالقرنین کی یہ سائنٹیفک دیوار کہاں تھی؟ آیا کہاں ہو سکتی ہے؟

قرآن جو کچھ ہمیں سکھانا اور دینا چاہتا ہے اس کے لئے ان امور کی تحقیق کے بدرجہ اولی ہم یقیناً محتاج نہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ صرف یاجوج ماجوج کے مسئلہ کی نوعیت مذکورہ بالا امور سے مختلف ہے ہم اس جز پر آئندہ ان شاء اللہ بحث کریں گے اور اسی بحث پر سورۂ کہف تقریباً ختم ہو جاتی ہے۔

(۳) یاجوج وماجوج:

"یاجوج وماجوج" کے الفاظ کی نوعیت قرآن کے ان اجمالی الفاظ واشارات کی نہیں ہے جن کی تفصیل وتشریح قرآنی مطالب ومقاصد کے سمجھنے اور سمجھانے کے لئے غیر ضروری ہو۔

اہمیت ان الفاظ کی یوں بھی ظاہر ہے کہ سورۂ کہف میں ذوالقرنین کے اس قصہ کے سوا قرآن ہی کی دوسری سورۃ الانبیاء تک میں بھی ان دونوں الفاظ "یاجوج وماجوج" کو ہم اس

مشہور آیت میں پاتے ہیں۔

حَتّٰی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ ● یَّنْسِلُوْنَ۔

"تا آں کہ جب کھول دیئے جائیں یاجوج و ماجوج ہر حدب سے تیزی کے ساتھ وہ چل نکلے۔"

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

دو مختلف سورتوں کی دو مختلف آیتوں میں "یاجوج و ماجوج" کے ان الفاظ کو پڑھ کر حضرت الاستاذ مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ من تبادر الاوهام فقط (یعنی خواہ مخواہ اس وہم میں لوگ مبتلا ہو گئے) کہ ذوالقرنین کی حکومت کی طرف سے دونوں پہاڑوں کے بیچ میں جو دیوار جو بنائی گئی تھی اس دیوار کو توڑ کر یاجوج و ماجوج نکل پڑیں گے۔ حالانکہ بقول شاہ صاحب۔

ولیس فی القرآن ان هذا الخروج یکون عقیب الاندکاک متصلا' بل فیه وعد باندکاکه فقط' فقد اندك کما وعد' اما ان خروجهم موعود بعد اندکاکه بدون فصل فلاحرف فیه۔ (فیض الباری شرح بخاری جلد نمبر ۳ صفحہ نمبر ۲۳)

"قرآن میں یہ کہیں نہیں ہے کہ یاجوج و ماجوج کے خروج کا واقعہ دیوار کے ڈھے جانے کے ساتھ ہی پیش آئے گا بلکہ دیوار کے ڈھے جانے کا صرف وعدہ (سورۃ کہف) والی آیت میں کیا گیا ہے اور دیوار حسب وعدہ ڈھے گئی لیکن یہ بات کہ دیوار کے ڈھے جانے کے ساتھ اسی وقت بغیر کسی وقفہ کے یاجوج و ماجوج نکل پڑیں گے قرآن میں کوئی حرف ایسا نہیں پایا جاتا جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔"

خلاصہ یہ ہے کہ سورۃ کہف کی آیت جس میں ذوالقرنین نے یہ کہتے ہوئے کہ "دیوار کی تعمیر میں کامیابی یہ صرف میرے پروردگار کی مہربانی ہے پھر جب میرے رب کا وعدہ آ جائے گا

● حدب کا ترجمہ میں نے حدب ہی کر دیا ہے آئندہ اس کی شرح آنے والی ہے۔ "کوہ بلندی" کی صفت کو عربی میں حدب کہتے ہیں گویا سمجھنا چاہئے کہ پانی کے اندر سے زمین کا جو حصہ ابھر کر باہر نکل آیا ہے ابھار کی وجہ سے کوہ بلندی کی کیفیت اس میں چونکہ پائی جاتی ہے۔ اسی لئے اس کو حدب کہا گیا ہے "ینسلون" کی تفصیل بھی آگے آ رہی ہے۔

تو اس وقت وہی میرا رب اس کو ریزہ ریزہ کردے گا یعنی قال هذا رحمة من ربي فاذا جاء وعد ربي جعله دكاء کا اس آیت کا جو ترجمہ اور ماحصل ہے خود ہی اس پر غور کیجئے اور دیکھئے اس میں ایسا کون سا لفظ ہے جس سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہو کہ دیوار کے گرنے یا گرانے اور توڑنے کے بعد یاجوج و ماجوج نکل پڑیں گے۔

مگر کیا کیجئے کہ عوام میں یہی مشہور ہو گیا ہے کہ بند ہونے کے بعد یاجوج و ماجوج کی قوم روزانہ اس کے توڑنے کی کوشش میں لگی ہوئی ہے اور آخر میں کسی نہ کسی دن اس کے توڑنے میں وہ کامیاب ہو جائے گی حالانکہ اسی موقع پر اسی آیت سے پہلے قرآن ہی میں

فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ یَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا۔

(پس وہ (یعنی یاجوج و ماجوج والے) نہ اس دیوار پر چڑھنے ہی کی قدرت رکھتے تھے اور نہ ان کے بس میں یہ تھا کہ اس دیوار میں نقب لگا سکیں یعنی سوراخ کر سکیں)

کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔"

بھلا نقب لگانا بھی جس دیوار میں ان کے بس کی بات نہ رہی تھی قرآن کی اس واضح اور صاف خبر کے بعد باور کرنا کہ وہی یاجوج و ماجوج والے اسی دیوار کو دکاء یعنی ڈھا کر برابر کر دیں گے یا انہوں نے برابر کر دیا قرآنی بیان سے لاپروائی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ "جعله دكاء" (بنا دے گا میرا رب اس دیوار کو ریزہ ریزہ) کی قرآنی اطلاع سے بھی ان کو چشم پوشی اختیار کرنی پڑتی ہے جو اس خبر کے مقابلہ میں کہتے ہیں کہ رب نہیں بلکہ یاجوج و ماجوج والے اس کو دکاء (ریزہ ریزہ) کر دیں گے۔

یہ صحیح ہے کہ تفسیری روایتوں میں بھی بعض ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں جن سے اس عام پھیلے ہوئے خیال کی تائید ہوتی ہے شاید اس عام پھیلے ہوئے خیال کا منشا ممکن ہے تفسیری کتابوں کی یہی روایتیں ہوں لیکن حضرت مولانا انور شاہ کشمیری (رحمۃ اللہ علیہ) جیسے ناقد عالم اسی مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے جب فرماتے تھے کہ:

انا لم نجده في القرآن ولا في حديث صحيح

یعنی (یاجوج ماجوج کا خروج دیوار توڑ کر ہو گا) اس مسئلہ کو ہم نہ قرآن ہی میں

پاتے۔ اور نہ کسی صحیح حدیث میں (فیض الباری شرح بخاری جلد ۴ ص ۲۴)

تو اسی سے ان روایتوں کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس سلسلہ میں ترمذی کی اس روایت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جس میں ہے کہ:

"یاجوج ماجوج والے روزانہ دیوار کو کھودتے ہیں پھر جب کچھ حصہ باقی رہ جاتا ہے تو گھروں کو یہ کہتے ہوئے پلٹ جاتے ہیں کہ کل ہم باقی کام کو پورا کر دیں گے مگر انشاء اللہ تعالیٰ نہیں کہتے پس جب دوسرے دن واپس ہوتے تو کھودی ہوئی دیوار کو اسی حال میں پاتے ہیں یعنی کھودنے سے پہلے جیسی تھی ویسی ہی اس کو پائیں گے یوں ہی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ تا آنکہ ایک دن انشاء اللہ ان میں سے کسی کی زبان سے نکل جائے گا تب صبح کو جب آئیں گے تو دیوار کھدی ہوئی حالت میں ملے گی اس کے بعد اس دیوار کو ڈھا دیں گے اور زمین میں فساد پھیلانے کے لئے نکل پڑیں گے۔"

مگر تفسیری روایات کے سب سے بڑے مشہور ناقد ابن کثیر کے نزدیک اس روایت کی سند میں غیر معمولی الجھنیں ہیں' خود حضرت شاہ صاحب کا ذاتی فیصلہ تو یہ ہے کہ مشہور نو مسلم یہودی عالم "کعب احبار" کا یہ قول ہے اور اسرائیلی روایت سے ماخوذ ہے ● اور جب آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآنی الفاظ ہی نے ان روایتوں کی تصحیح کی گنجائش باقی نہیں رکھی ہے قرآن خبر دے رہا ہے کہ دیوار میں نقب زنی بھی ان کے بس کی بات نہ تھی تو پھر اسی دیوار کے متعلق یہ باور کرنا کہ

● تفصیل کے لئے دیکھئے شرح بخاری (جلد ۴ ص ۲۴) شاہ صاحبؒ کے الفاظ ہیں کہ "بحکم وجدانی انه لیس بمرفوع بل هو من کعب نفسه" جہاں تک میرا خیال ہے مسلمانوں میں یاجوج و ماجوج کے متعلق زیادہ تر قصے یہودیوں ہی کی کتابوں سے ماخوذ ہیں اور جیسا کہ قدیم مکاشفات کا قاعدہ تھا کہ استعارے کے رنگ میں لوگ مطلب کو بیان کرتے تھے۔ اگر یہ سمجھا جائے کہ یاجوج و ماجوج باہر نکلنے کے لئے بجائے اتفاقی و اتحادی کوشش میں دن بھر اپنی قوت تقریر صرف کیا کرتے تھے لیکن رات کو جب واپس ہوتے تو اختلافات پھر تازہ ہو جاتے۔ دیوار کو زبان سے چاٹ چاٹ کر پتلی بنانے کا مطلب ممکن ہے کہ یہی ہو۔ اس زمانہ میں دیکھا جاتا ہے کہ یورپ کی قومیں اپنے مشکلات کو کمیشن اور مجلس، انجمن وغیرہ کی تقریروں سے حل کرتی ہیں بہر حال ان یہودی روایتوں کا نہ قرآن ہی ذمہ دار ہے' نہ رسالت کے لانے والے پیغمبر ﷺ کے صحیح بیانات میں ان کا نشان ہے۔ ۱۲

یاجوج و ماجوج والے اس میں صرف نقب لگانے تک میں کامیاب نہ ہوئے بلکہ اس کا دکاء (یعنی ریزہ ریزہ) کر کے رکھ دیا۔ یہ بھی کچھ سمجھ میں آنے کی بات ہے؟

خلاصہ یہ ہے کہ دیوار کا حق تعالیٰ کے مقرر کردہ وقت پر منہدم ہو جانا یہ بجائے خود ایک الگ واقعہ ہے جس کی اطلاع سورۂ کہف میں دی گئی ہے اور یاجوج و ماجوج کا نزول یا چھا جانا یا ان کا خروج جس کی پیشین گوئی سورۃ الانبیاء میں کی گئی ہے یہ دوسرا مستقل واقعہ ہے کیونکہ ان دونوں واقعات کا ذکر بھی دو مختلف سورتوں میں کیا گیا ہے۔

اس عام غلط فہمی کے ازالے کے بعد اب میں چاہتا ہوں کہ یاجوج و ماجوج کے متعلق قرآن سے جو معلومات فراہم ہوتی ہیں ان کو ایک خاص ترتیب کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کروں ذیلاً اس سلسلہ میں معلومات کے دوسرے ذرائع سے بھی کچھ کام لیا جائے گا۔

یہ صحیح ہے کہ سرسری طور پر قرآنی آیات سے گزرنے والوں کو بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ قرآن نے ''یاجوج و ماجوج'' کے ذکر میں حد سے زیادہ اجمال سے کام لیا ہے لیکن آپ اگر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ باوجود اجمال کے پھر بھی قرآن نے اس قوم کے حال کو چار مختلف ادوار (Periods) میں گویا تقسیم کر کے بیان کیا ہے۔

یاجوج و ماجوج کی خصوصیات:

اس سلسلہ میں قرآن سب سے پہلے ان کے جس حال سے روشناس کراتا ہے وہ وہی سورۂ کہف کی آیت:

إِنَّ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ۔

''یاجوج و ماجوج زمین میں بگاڑ پیدا کرنے والے لوگ ہیں''

کے الفاظ سے سمجھا جاتا ہے۔ ذوالقرنین پہاڑوں کے بیچ رہنے والی قوم میں جب پہنچے تو اس قوم نے ان ہی الفاظ میں ''یاجوج و ماجوج'' والوں کے متعلق ان سے یعنی ذوالقرنین کے دربار میں رپورٹ پیش کی۔ یہ واقعہ دنیا کے کس خطہ کا ہے؟ اور کس زمانہ کا ہے؟ عرض کر چکا ہوں اس کا پتہ چلانا آسان نہیں ہے لیکن واقعہ کہیں کا ہو اور کسی زمانہ میں بھی پیش آیا ہو تاہم بہرحال

رخ جب ان کا دیوار بن جانے کی وجہ سے پھر گیا تو آپس ہی میں باہم ایک دوسرے کے ساتھ ایسی زندگی گزارنے لگے تھے قرآن نے خاص الفاظ یعنی **بعضهم يومئذ يموج في بعض** کے ذریعہ ادا کیا ہے۔ اس میں ان تعلقات کی کس نوعیت اور کیفیت کی تعبیر ہے؟ غیروں سے مایوس ہو جانے کے بعد یاجوج و ماجوج والے زندگی کے اس دور میں لڑتے جھگڑتے اور باہم دست و گریباں رہتے تھے اس مفہوم کے ادا کرنے کے لئے عربی زبان میں بیسیوں تعبیریں ہو سکتی تھیں۔

اسی طرح میل ملاپ' باہمی امداد و مواسات' موانست کی زندگی کی تعبیر کے لئے بھی اس زبان میں الفاظ کی کمی نہ تھی۔ لیکن تعبیر و بیان کے ان دونوں طریقوں کو چھوڑ کر قرآن نے **بعضهم يومئذ يموج في بعض** کے الفاظ جو یہاں استعمال کئے ہیں واضح طور پر ان دونوں حالتوں میں سے کسی خاص حالت کو متعین کرنا دشوار ہے۔

لفظ موج کی تشریح:

لفظ موج کے لفظ سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ تلاطم اور طوفان کے وقت سمندر اور دریا میں موجوں کی جو کیفیت ہوتی ہے یعنی سمندر کی سطح بجائے ساکن کے صرف لرزش و اضطراب' بے چینی اور بے قراری کی تصویر بن جاتی ہے۔ اور لامحدود بے شمار موجیں اٹھ اٹھ کر ایک دوسرے کو دھکیلتی ہی چلی جاتی ہیں اور اسی طرح ہر پچھلی موج پہلی کو آگے بھی بڑھاتی رہتی ہے۔ ہم ان موجوں کے متعلق یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان میں ایک دوسرے پر چڑھ جانا بھی پایا جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان میں ہر ایک کی ہستی دوسری ہستی سے وابستہ بھی ہے اور ایک دوسرے

(گزشتہ سے پیوستہ) رکھتا ہے اور وہ بھی اصلاح اور بنی آدم کے باہمی تعلقات کے بگاڑ کے مقابلہ میں ان کے تعلقات کو بگاڑ کر امن و امان اور باہمی اعتماد کے اطمینان کی زندگی کو برباد کرنا ہو سکتا ہے۔ قرآن ہی میں دوسری جگہ ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے جن میں اپنی برتری اور علو کا جذبہ پایا جاتا ہے ان کی طرف بھی فساد ہی کے جرم کو منسوب کیا گیا ہے فرمایا گیا ہے "تلك الدار الآخرة نجعلها للذين لا يريدون علوا في الأرض ولا فسادا" جس سے معلوم ہوا کہ اپنی برتری اور علو کا اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے لوگوں میں پھوٹ ڈالنا اسی پالیسی کو یہ لوگ اختیار کر لیتے ہیں۔

کو آگے بڑھنے اور بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتی بھی چلی جاتی ہے۔ آپس میں موجیں ایک دوسرے سے گویا لڑتی بھی ہیں لیکن ان میں ہر ایک کی بقا کی ضامن بھی باہم یہی موجیں اور ان کے خصوصی تعلقات ہی ہوتے ہیں۔

الغرض بعضهم يومئذ يموج في بعض کے الفاظ سے صرف یہ مطلب نکالنا کہ غیروں سے ہٹ جانے کے بعد یاجوج وماجوج والے باہم ایک دوسرے سے لڑتے بھڑتے ہی رہتے تھے یا اس کے بالمقابل یہ سمجھنا کہ جیسے سمندر کی موجوں کا وجود باہم ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ و باہم رشتہ رہتا ہے۔ اور ہر موج دوسری موج کو آگے بڑھاتی ہے' اسی طرح یاجوج و ماجوج والے بھی آپس میں بجائے دست و گریباں رہنے کے ایک دوسرے کے ساتھ چولی دامن کا تعلق رکھتے تھے یعنی غیروں میں تو بجائے اصلاح اور سنوار کے فساد اور بگاڑ پیدا کرتے تھے' لیکن آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملے جلے باہم ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ ان دونوں مطالب میں سے کسی ایک مطلب کے ساتھ قرآنی الفاظ اور تعبیر کو محدود کر دینا غالباً صحیح نہ ہوگا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا اگر یہی سمجھانا قرآن کا مقصود تھا تو ان دونوں مطالب میں سے ہر ایک کی تعبیر کے لئے عربی زبان میں جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں' سرمایہ کی کیا کمی تھی؟ پھر جب ان ساری تعبیروں کو ترک کر کے ایک خصوصی تعبیر اس موقع پر قرآن میں جو اختیار کی گئی ہے۔ ہمیں اس کی مصلحت سے چشم پوشی نہ کرنی چاہئے اور لاپروائی سے کام لیتے ہوئے ان دونوں مطالب میں سے کسی ایک مطلب کا سرسری ذکر کر کے آگے بڑھ جانا قرآنی الفاظ کی ناقدری ہوگی۔ ہمیں اس ذمہ داری کو محسوس کرنا چاہئے کہ خالق کائنات کے کلام پر غور کر رہے ہیں۔ ہر بولنے والے آدمی کے کلام پر اس لاہوتی کلام کو قیاس کرنا مناسب نہ ہوگا۔

سوال یہی ہوتا ہے کہ پھر ان الفاظ کا مطلب کیا سمجھا جائے؟ ظاہر ہے کہ موج کا لفظ سمندر اور دریا کی متلاطم سطح اور اس پر ابھرنے والی موجوں کی جس تصویر کو بے نقاب کر رہا ہے۔ اسی تصویر کو ہم اپنے سامنے رکھ کر قرآن جو کچھ سمجھانا چاہتا ہے اسے کیوں نہ سمجھیں؟ کوئی مانے یا نہ مانے لیکن فقیر کا ذہن تو یہی پاتا ہے کہ غیروں سے ہٹ جانے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

زندگی کے اس دور میں یاجوج وماجوج کی قوم کی زندگی صرف اضطراب اور بے قراری، ہنگامہ اور لرزش وجنبش ہی بن کر رہ گئی تھی۔ ایسے مشاغل میں وہ مبتلا تھے جن میں صبح وشام، شب وروز، صحرا و دو، دوڑ دھوپ، آمد و رفت، چلنے پھرنے، دوڑنے بھاگنے کے ہنگامے ہی برپا رہتے ہیں۔

یہ تو ان کی عام زندگی کا عام نقشہ تھا اور باہم اس قوم کی مختلف ٹولیاں ایک دوسرے سے ساتھ الجھی بھی رہتی تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ان میں کوئی ٹولی دوسری ٹولی کو کلیۃً ختم کرنے کا بھی فیصلہ اس لئے نہیں کر سکتی تھی کہ اس میں خود اپنے وجود کے اختتام کا خطرہ اس کو محسوس ہوتا تھا۔ کچھ علامات ہی اس قوم کے ایسے تھے کہ نہ ایک دوسرے سے کلیۃً الگ ہو سکتے تھے اور نہ ان میں کوئی دوسرے سے ٹوٹ کر یا جدا ہو کر فنا ہونے ہی کے لئے تیار تھا۔ گویا ان میں وہی تعلقات قائم تھے جو باہم دریائی موجوں میں ہوتے ہیں۔ یعنی طور پر باہم ایک دوسرے کو دھکیلتے بھی رہتے تھے لیکن اسی کشمکش میں ارادی یا غیر ارادی طور پر ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے میں مدد بھی مسلسل ملتی چلی جاتی تھی۔

اسی کے ساتھ میرا دھیان "بعضهم يومئذ يموج في بعض" کے الفاظ سے کچھ ادھر بھی جاتا ہے کہ تبعیض وتجزی یعنی یاجوج ماجوج کی تقسیم بھی محدود تھی، بلکہ موجوں کا جو حال ہوتا ہے کہ ان کو کوئی گننا چاہے تو گن نہیں سکتا۔ ان میں بڑی موجیں بھی ہوتی ہیں اور چھوٹی بھی۔ کچھ یہی حال معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے اس دور میں ان کا ہو گیا تھا کہ ان گنت بے شمار ٹولیوں میں وہ بٹے ہوئے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ غیروں میں تو فساد اور بگاڑ پیدا کرنا یہی یاجوج وماجوج والوں کا شیوہ تھا اور خود باہم ایک دوسرے کے ساتھ موجی تعلقات رکھتے تھے۔

اب تک قرآن کی دو اطلاعوں سے اس قوم کی ان ہی دو خصوصیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ باقی ان کی زندگی کے دوسرے دور کو بیان کرتے ہوئے شروع میں ترکنا (چھوڑ دیا ہم نے) کا لفظ جو پایا جاتا ہے کیا اس سے بھی کسی خاص واقعہ اور یاجوج وماجوج والوں کے متعلق کسی خاص پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟

کیا یاجوج و ماجوج اولاد آدم نہیں؟

واقعہ یہ ہے کہ یاجوج و ماجوج والوں کے متعلق اتنی بات تو بہرحال ایک اجماعی مسئلہ ہے کہ یہ لوگ حضرت نوحؑ کی اولاد ہیں نہ ان کا تعلق جن وغیرہ جیسی ہستیوں سے ہے بلکہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں بالاتفاق ان کو بھی شمار کیا جاتا ہے۔ بعض ناقابل اعتبار روایتوں میں کچھ اس قسم کا اشارہ پایا جاتا ہے جس سے سمجھا جاتا ہے کہ ماں کی طرف سے حضرت حوا پر یاجوج و ماجوج کی نسل ختم نہیں ہوتی' بالفاظ دیگر ددھیال تو ان کی وہی ہے جو عام انسانی نسلوں کی ہے لیکن ننھیال میں کچھ فرق پیدا ہو گیا ہے۔ ❶

لیکن ظاہر ہے کہ یہ سارے قصے سب تخمینی ہیں اور کوئی فیصلہ قطعی ان معاملات میں دشوار ہے' تاہم یاجوج و ماجوج کے متعلق رطب و یابس روایتوں کا جو ذخیرہ کتابوں میں پایا جاتا ہے اسی میں ایک روایت کے اندر یہ الفاظ بھی ملتے ہیں:

یاجوج و ماجوج لم یکن فیهم صدیق قط ولا یکون ابدا

(جلد ۴ ص ۲۵۱ در منثور)

"یاجوج و ماجوج میں کبھی کوئی صدیق ہوا اور نہ کبھی ہو گا۔"

"صدیق" ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ سے خصوصی تعلق رکھنے والوں کے ایک خاص طبقہ کی قرآنی تعبیر ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں کے لئے بھی اسی صدیق کے لفظ کو قرآن نے استعمال کیا ہے۔ ہر قسم کے شکوک و شبہات سے جس کی تصدیق اور جس کا یقین کلیتہً

---

❶ یہ میرا ذاتی خیال ہے جو خواب کی بنیاد پر قائم ہوا لیکن تعبیر بلکہ حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ سے خیال بھی ماخوذ ہے۔ فتوحات مکیہ میں انہوں نے لکھا ہے ابن حجر نے "فتح الباری" میں بھی اسی کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ "یاجوج و ماجوج من اولاد آدم لا من حواء عند جماهیر العلماء" (فتح الباری جلد ۱۳ ص ۱۱) لفظی ترجمہ جس کا یہ ہے کہ یاجوج و ماجوج اولاد آدم میں ہیں لیکن اماں حوا سے پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ شیخ نے اسی کو جمہور علماء کا خیال قرار دیا ہے۔ ابن حجر کو ان کے دعویٰ پر تعجب ہوا ہے لیکن العلماء سے مراد علمائے کشف و شہود ہوں یا تو شیخ کے کلام کی توجیہ کی ایک صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ خود شیخ اکبر کا کشف و شہود سے تعلق نہیں لیکن بعض روایا میں خود اس کو بھی کچھ نہ کچھ دکھایا گیا تھا اور اسی نے علماء کا مطلب میری سمجھ میں آتا ہے کہ علماء سے مراد کشفی ہی ہیں۔ آگے بھی اپنے اس خواب کے بعض اجزاء کی طرف اشارہ کروں گا۔ ۱۲

پاک ہو بظاہر "صدیق" اس کو کہتے ہیں۔

بہرحال "ترکنا" (چھوڑ دیا ہم نے) کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے اس دور میں جب وہ سراپا اضطراب اور ہمہ تن حرکت و گردش بن کر رہ گئے تھے۔ قدرت نے بھی ان کو چھوڑ دیا تھا اور آسمانی رہنمائی نے ان کی دستگیری نہیں کی۔ اسی لئے ان کی تاریخ کا یہ عہد نبوات و رسالات اور ان کے آثار سے بالکل خالی ہو گیا اور ایسی قوم یا امت جو آسمانی رہنمائی کی روشنی سے محروم ہو مجبور ہے کہ اپنی شخصی، خاندانی، قومی، عام انسانی تعلقات کے لحاظ سے اپنے آپ ہی قومیں بنائے۔ قدرت کی چھوڑی ہوئی یا متروک اللہ قوم خود سوچئے کہ اس کے سوا اور کر ہی کیا سکتی ہے۔ ●

● واقعہ یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے عہد کے مشہور طوفان کا ذکر فرماتے ہوئے قرآن میں ہے "وجعلنا ذریتہ ہم الباقین" (ہم نے نوح ہی کی نسل کو باقی رہنے دیا) اسی سے سمجھا جاتا ہے کہ آدم علیہ السلام کی موجودہ نسل و نسب کا سلسلہ نوح علیہ السلام پر ختم ہوتا ہے لیکن قرآن ہی کی سورۂ ہود میں یہ آیت بھی ملتی ہے۔ "قیل یا نوح اہبط بسلام منا وبرکات علیک وعلیٰ امم ممن معک وامم سنمتعہم ثم یمسہم منا عذاب الیم" (کہا گیا کہ اے نوح! اتر ہماری طرف سے سلامتی ہو تیرے ساتھ ہماری جانب سے اور برکتیں تجھ پر بھی ہوں اور ان امتوں پر بھی ہوں جو تیرے ساتھ ہیں اور کچھ امتیں ایسی ہیں جنہیں آئندہ زندگی کا ہم متاع اور سرمایہ بخشیں گے پھر ان کو پکڑے گا دردناک عذاب) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام اور کشتی میں جو ان کے ساتھ تھے ان کے سوا بھی کچھ امتیں ایسی ہیں جنہیں آئندہ زمانے میں دنیاوی مال و متاع سے استفادہ کا موقع دیا جائے گا پھر ان کو عذاب پکڑے گا جس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں کو جو چھوڑ دیا جائے گا اس سے غلط کام لیں گے بہرحال قرآن کی دونوں آیتوں کو پیش نظر رکھ کر اگر یہ سمجھا جائے کہ بقا کی خبر نوح کی ذریت ہی کے متعلق جو دی گئی ہے یہ ان لوگوں کی حد تک محدود ہے جن کی طرف نوح علیہ السلام مبعوث تھے گویا یہ سمجھنا چاہئے کہ ان لوگوں میں صرف نوح کی نسل ذریت طوفان سے بچ کر رہ گئی اور آئندہ زمانے میں دنیا و متاع کا فائدہ جن کے متعلق قرآن میں کیا گیا ہے یہ دوسرے لوگ تھے۔ اس موقع پر مذکورہ بالا آیت کے بعد فرمایا گیا ہے کہ غیب کی خبریں ہیں نہ تم ہی ان کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم ہی میری وحی کرنے سے پہلے ان سے واقف تھی۔ یعنی "تلک من انباء الغیب نوحیہا الیک ما کنت تعلمہا انت ولا قومک من قبل ہذا" کا جو خلاصہ ہے یہ حصہ بھی قابل توجہ ہے نوح علیہ السلام کے قصے سے جیسا کہ معلوم ہے اور جاہلیت کے کلام سے بھی پتہ چلتا ہے عرب کے باشندے واقف تھے۔ جب یہود و نصاریٰ سے ان کے تعلقات تھے تو واقف رہنے کی وجہ پیدا ہو سکتی ہے خصوصاً طوفان کا یہ قصہ یا قصے (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

بہرحال عام طور پر تو معمورۂ ارض پر پھیلی ہوئی انسانی نسلوں کی موروثی روایتوں اور تاریخی شہادتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ عام معاشی ضرورتوں کی فراہمی کے لئے جہاں ان کو حواس (بینائی، شنوائی وغیرہ کی قوتوں) اور ان حسی و ادراکی قوتوں کے معلومات کے استعمال کے واسطے عقل دی گئی ہے، ان ہی کے ساتھ زندگی کے بنیادی سوالات جو انسانی فطرت میں عموماً پیدا ہوتے رہتے ہیں، یعنی ہم کہاں سے آئے ہیں، کہاں جا رہے ہیں؟ اور یہاں ہمارے آنے کی

(گزشتہ سے پیوستہ) جس کا ذکر کسی نہ کسی شکل میں دنیا کی تمام قوموں میں پایا جاتا ہے حتیٰ کہ امریکہ کی قدیم قوموں میں بھی اور گمنام جزائر کے باشندوں میں بھی اسی صورت میں قرآن کا یہ دعویٰ کہ نہ تم ہی واقف تھے نہ تمہاری قوم اس کا تعلق بظاہر تجربی عمومی حیثیت سے معلوم ہوتا ہے خصوصاً یہ خبر کہ نوح کے ساتھیوں کے سوا بھی کچھ نسلیں تھیں جنہیں آئندہ دنیا سے استفادہ کا موقع دیا جائے گا۔ یہ قطعاً نئی خبر ہے قرآن ہی میں سب سے پہلے اس کو ہم پاتے ہیں۔

اب اسی کے ساتھ سورۃ الحدید کی اس آیت میں غور کیجئے: "ولقد ارسلنا نوحا و ابراھیم و جعلنا فی ذریتھما النبوۃ و الکتب" (ہم نے نوح کو اور ابراہیم کو رسول بنایا اور ان ہی دونوں (نوح و ابراہیم) کی نسل کو نبوت اور کتاب ہم نے دی) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام کی نسل میں جو نسلیں نہ تھیں ان کو نبوت اور کتاب سے محروم رکھا گیا گویا نہ رکھنا کے مکمل لفظ میں جو اشارہ یہاں پایا جاتا ہے ہم اس اشارے کو ان تفصیلات سے سمجھ سکتے ہیں۔ باقی نوح کے سوا کچھ نسلیں موجود تھیں۔ قرآن کی رو سے آئندہ زمانے میں تمتع کا موقع جن کو ملنے والا تھا ان کے متعلق کچھ اشارے بائبل میں ملتے ہیں۔ آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل (قائن) میں جیسا کہ معلوم ہے قائن (قابیل) نے ہابیل کو مار ڈالا (کہتے ہیں کہ یہی نئی بات عرب میں پہنچا جاتا تھا اس ہابیل کی موروثی تھی۔ واللہ اعلم)

بہرحال قائن کے متعلق بائبل میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے قائن کو زمین کا لعنتی قرار دیا تب قائن نے کہا کہ میری سزا میری برداشت سے باہر ہے اور بولا "دیکھ آج تو نے مجھے روئے زمین سے نکال دیا ہے۔ میں تیرے حضور سے روپوش ہو جاؤں گا (پیدائش ۴: ۱۴) ظاہر ہے کہ روئے زمین سے مراد زمین کا وہ آباد حصہ ہی ہو سکتا ہے۔ جس میں عام آبادی تھی اور طوفان نوح میں بظاہر یہی روئے زمین والے آدمی بجز ذریت نوح کے ہلاک ہو گئے اور قائن روپوش ہو کر زمین کے ایسے حصوں میں جا کر چھپ گیا جو عموماً انسانی سکونتوں سے خالی تھے پھر آگے بائبل میں بیان کیا گیا ہے کہ "نود کی علاقہ میں قائن جا بسا" واللہ اعلم)

یہ نود کس علاقہ کا نام ہے؟ اسی موقع پر یہ بھی ہے کہ "قائن خدا کے حضور سے نکل گیا"۔ پھر بائبل میں اطلاع دی گئی ہے کہ "قائن اپنی بیوی کے پاس گیا وہ حاملہ ہوئی" یہاں یہ پیچیدہ سوال ہے کہ جب وہ اس جماعت سے روپوش ہو گیا۔ جس میں آدم علیہ السلام اپنی اولاد کے ساتھ تھے تو قائن کو (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

اور چند دن کے قیام کے بعد روانہ ہو جانے کی آخر غرض کیا ہے؟ الغرض ان کی ابتدا وانتہا اور وجود کے
مدعا کے سوالوں کے جواب کا علم عقل و حواس کے سوا ایک اور مستقل علمی ذریعہ (وحی و نبوت) کی
راہ سے عطا کیا گیا ہے۔

لیکن اگر کسی امت یا قوم کی تاریخ علم کے اس مستقل ذریعے کے ذکر سے خالی ہے اور اسی
لئے زندگی کے مذکورہ بالا بنیادی سوالوں کے متعلق قطعی فیصلے کے علم و یقین سے اپنے آپ کو وہ
محروم پاتی ہے تو واقعہ یہ ہے کہ اس کے سوا اور نتیجہ ہی کس بات کا تھا۔ ایسا آدمی جو بینائی کی
قوت سے محروم ہو اگر روشنی کے متعلق صحیح علم اپنے اندر نہیں پاتا تو آخر وہ بیچارہ کیا کرے؟ ہر چیز
کے جاننے کا قدرت ہی نے ایک خاص ذریعہ مقرر بنا دیا ہے آواز کو ہم آنکھوں سے یا رنگ کو ہم
کانوں سے جاننا چاہیں گے تو کیا اس میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟ پھر زندگی کے بنیادی سوالوں
کے حل اور ان کے جوابات کے جاننے کی جو قدرتی راہ ہے یعنی وحی و نبوت اس سے محروم رہ کر
صرف حواس و عقل کے زور سے کوئی قطعی غیر مشکوک فیصلہ ان سوالوں کے متعلق اپنے اندر کیسے پا
سکتا ہے۔ روایتوں میں جو آیا ہے کہ "ان میں نہ کبھی کوئی "صدیق" ہوا ہے اور نہ آئندہ ہوگا"
اس کا مطلب یہی تو ہے کہ صدیق کے معنی ہی یہ ہیں کہ ان بنیادی سوالوں کے جوابوں کا ایسا
غیر متزلزل یقین و علم اس کے اندر پیدا ہو جائے جو ہر قسم کے شکوک و شبہات کی آلائشوں سے پاک ہو
اور ان جوابوں کے علم و دریافت کی جو قدرتی راہ ہے اس سے محروم رہ جانے والوں کے لئے اس علم
و یقین تک رسائی آخر کیوں کر ممکن ہو سکتی ہے؟ عقل کے زور سے اس کو پانا بھی چاہیں گے تو ان کی
مثال اس بہرے کی سی ہوگی جو سونگھ کر یا چھو کر آواز کے سننے کی کوشش کر رہا ہو۔

(گزشتہ سے پیوستہ) معلوم ہوتا ہے کہ بائبل کی نسل قائن کی نسل تک جس کی نسل اور جس علاقہ میں آباد تھے
اسی علاقہ تک محدود تھی۔ چنانچہ قائن کا بیٹا لکھا ہے کہ حنوک نامی پیدا ہوا اور حنوک کی چوتھی پشت میں لمک پیدا ہوا۔
لمک نے دو بیویوں سے نکاح کیا، ایک سے بائبل میں لکھا ہے کہ ایک بیٹا یابل پیدا ہوا جن میں ایک
بربط اور بنسی بجانے والوں کا باپ تھا اور دوسرا بیٹا تیز ہتھیار بنانے والا تھا یعنی ہتھیاروں کے بنانے
والے کا نام بائبل میں توبل قائن بتایا گیا ہے۔ گویا گانا بجانا اور مرثیہ گوئی کے آلات کے موجد قائن ہی کی اولاد تھی۔
مشرق سے مغرب کی طرف جانے والوں کو ان ہی علاقوں سے گزرنا پڑتا ہے یہ ساری باتیں قابل توجہ ہیں۔

سرشت میں کوتاہی کے دعوے سے اس کی توجیہ اولاً آسان نہیں ہے اور اس قسم کی فطری کوتاہیوں کا اقرار کر بھی لیا جائے تو آگے بڑھ کر پھر وہی سوال واپس ہو جاتا ہے کہ قدرت نے انسانی نسل میں پیدا کر کے اس کوتاہی کو ان میں باقی کیوں رہنے دیا۔

بلکہ اصل یہی ہے کہ بنی آدم کے سارے نوعی اقتضاؤں کو جب ہم ان میں پاتے ہیں، وہ بھی اسی طرح دیکھتے ہیں جیسے انسانوں کی ساری نسلیں دیکھتی ہیں، اسی طرح سنتی ہیں جیسے سب سنتے ہیں، اسی طرح سوچتے ہیں جیسے سب سوچتے ہیں، ان ہی چیزوں کی ضرورت وہ بھی محسوس کرتے ہیں جن کی ضرورت سب محسوس کرتے ہیں۔

الغرض اندر ہو یا باہر، پانے والوں نے جب سب کچھ ان میں بھی پایا ہے جو کچھ دوسروں میں پایا جاتا ہے یا پایا جا سکتا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ وہی دہریت سے ان کی لاپروائیوں اور ان کی اجنبیت و توحش کو جبلت کے کسی نقص یا کوتاہی کا نتیجہ قرار دیا جائے بلکہ یقیناً اس میں ان کے اراوی طغیان اور سرکشی کے ان احساسات کو دخل ہے جنہیں بے باکانہ مشاغل کے انہماک نے ان میں پیدا کر دیا ہے۔

کسی مجازاتی و مکافاتی ہمہ جا۔ ہر وقت نگران قوت کے حضور کا خیال ان کی من مانی خواہشوں اور عنان گسیختہ امنگوں اور ارمانوں کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ گریز کی واحد منطق یہی ہو سکتی تھی کہ جس ذریعہ سے اس قوت کی نگرانی و حضور کا دباؤ انسانی فطرت محسوس کرتی ہے اسی سے انجان بن جانے کی ذہنیت کی پرورش میں اتنا مبالغہ کیا جائے کہ کوئی اس کا مطلب سمجھاتا

(گزشتہ سے پیوستہ) فطرۃ رہ گئیں مگر ایک فائدہ بھی ہوا کہ غیب سے کلیۃً منقطع ہو کر صرف عالم محسوس ہی میں ان کی ساری توانائیاں جذب ہو گئیں۔ کمانے بچانے کے آلات اور مردم کشی کے اوزار کی ایجاد کا سہرا غالباً اسی یکسوئی کی بدولت ان کے سر بندھا (واللہ اعلم بالصواب)

اسی سے شاید پچھلے دنوں یورپ میں یہ غلغلہ جو بلند ہوا کہ انسانی شجرہ نسب کی ابتدا سائنس کی رو سے بندروں پر ہوئی ہے۔ یوں بھی لوگ کہتے ہیں کہ خچروں کو دیکھ کر بیک وقت گھوڑے کے ساتھ گدھے کی اور گدھے کے ساتھ گھوڑے کی صورت جھانکنے لگتی ہے۔ اسی طرح بعض خاص نسلوں کے افراد کو دیکھ کر عوام کے دل میں آدمی کے ساتھ بندروں کا اور بندر کے ساتھ انسان کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ بے وغیرہ الفاظ سے چاہے اس احساس کا عوام اظہار بھی کرتے رہتے ہیں۔ ۱۲

بھی ہو جائے تو سمجھنے سے اپنے آپ کو معذور بنایا جائے۔

الغرض سہل پسندی انسانی اقتضاؤں کے اشتراک کے ساتھ ساتھ اچانک انسانی فطرت ہی کے اسی ایک خاص اقتضا کے ساتھ ان کا برتاؤ کسی اضطرار اور بے چارگی کا نہیں بلکہ ان کے اختیار و ارادہ کی غمازی کر رہا ہے۔ جان سکتے ہیں لیکن نہ جاننے کا فیصلہ ہی کر کے بیٹھ گئے ہوں ان کے جاننے کی صورت ہی کیا باقی رہتی ہے۔ ●

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کے قومی مزاج کے اسی طاغوتی فیصلہ نے ان کو وحی و نبوت سے محرومی کی سزا کا سزاوار ٹھہرایا۔ جب وہ طے ہی کیے ہوئے تھے کہ ہم نہیں سنیں گے تو سنانے والوں کو ان میں بھیجنے کا حاصل ہی کیا ہوتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ گو "لسر کنا" کے قرآنی لفظ کو چنداں اہمیت نہیں دی گئی۔ چنداں کیا معنی! سوال ہی نہیں اٹھایا گیا کہ اس خاص لفظ کو قرآن نے اس موقع پر کیوں استعمال کیا ہے۔ اسی لئے اس اجمال کی تفصیل میں مجھے ذرا زیادہ دراز نفسی سے کام لینا پڑا ورنہ پہلے سے کتابوں میں اس کے متعلق اگر کچھ مواد موجود رہتا تو چند الفاظ ہی ان کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کافی ہو سکتے تھے۔

● اس موقع پر جاحظ کی مشہور ادبی کتاب "البخلاء" کے ایک لطیفہ کا خیال آ رہا ہے۔ بغداد کے ایک تاجر کے پاس قزوین کا کوئی تاجر ہر سال مہمان بن کر چند دنوں قیام کرتا تھا۔ میزبانی میں خاطر مدارت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا تھا۔ قزوینی مہمان ہمیشہ بغدادی میزبان سے آرزو کرتا کہ آپ کبھی قزوین کیوں نہیں آتے میرے دل کی حسرت دل ہی میں رہ جائے گی۔ مدتوں کے بعد اتفاقاً بغدادی کو یہاں قزوین کی ضرورت سے پہنچنا پڑا۔ اپنے قزوینی دوست کا خیال آیا۔ دکان پر پہنچا۔ خیال تھا کہ دیکھتے کے ساتھ قزوینی دوست لپٹ پڑے گا۔ سامنے اپنی دوکان پر دیکھا کہ بیٹھا ہے۔ بغدادی نے سلام کیا لیکن سرے سے جواب بھی نہ ملا۔ خیال ہوا کہ سفر کے لباس ہونے کی وجہ سے قزوینی دوست نے پہچانا نہیں۔ عمامہ اتار دیا اور سلام کیا مگر وہی بے رخی اب بھی باقی تھی۔ عمامہ اتار دیا مگر ادھر پھر بھی کسی قسم کی جنبش نہ ہوئی۔ صرف کرتہ رہ گیا تھا کرتہ بھی اتار کر بے تکلف ہو کر کھڑا ہو گیا تب قزوینی دوست نے کہا "اگر جسمت بدرآئی من ترا نشناسم"
یعنی اپنی کھال اتار کر بھی میرے سامنے تم کھڑے ہو جاؤ گے تب بھی میں تمہیں نہیں پہچانوں گا۔ جب نہ پہچاننے کا فیصلہ ہی قزوینی کر چکا تھا تو ظاہر ہے کہ اس کے بعد پہچاننے کے لئے گنجائش ہی کیا باقی رہ گئی تھی۔

قرآن سے یاجوج و ماجوج والوں کی زندگی کے دوسرے دور کی جن خصوصیات کا پتہ چلتا ہے وہ تو یہی تھے۔ اب آیئے ان ہی لوگوں کی زندگی کے تیسرے دور پر۔

دوسرے دور میں بتایا گیا تھا کہ "باہم ایک دوسرے میں موج زن رہے" گویا غیر قوموں سے اس دور میں ان کا رشتہ منقطع ہو گیا تھا لیکن سورۂ کہف میں تو نہیں بلکہ سورۃ الانبیاء کی اس مشہور آیت یعنی

حَتّٰی إِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ۔

"تا اینکہ کھول دیئے گئے یاجوج و ماجوج اور وہ ہر حدب سے تیزی کے ساتھ چل نکلے"

سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر قوموں سے منقطع اور بے تعلق ہو جانے کے بعد پھر ان کو ایک موقع غیر قوموں کی طرف رخ کرنے کا دیا جائے گا اور اسی کو میں یاجوج و ماجوج والوں کی قومی زندگی کا تیسرا دور قرآن کی رو سے خیال کرتا ہوں۔ چونکہ اس دور کا ذکر سورۂ کہف میں نہیں بلکہ عرض کر چکا ہوں کہ یہ سورۃ الانبیاء کی آیت ہے اس لئے اس تفصیلات کا ذکر آئندہ کروں گا۔

پہلے چوتھے دور کے متعلق جس کا تذکرہ سورۂ کہف میں کیا گیا ہے اسے پڑھ لیجئے۔ یہ چوتھا دوران کا میرے خیال میں ہے جسے ہم سورۂ کہف کی اس آیت میں پاتے ہیں۔ یعنی:

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا۔ (سورۂ کہف)

"اور پھونک دیا جائے صور پھر ہم ان کو (یاجوج و ماجوج) کو اچھی طرح سمیٹ کر سمیٹ لیں گے۔

مطلب وہی ہوا کہ نفخ صور کے بعد جیسے ساری انسانی نسلیں ان کے اگلے پچھلے بڑے چھوٹے مرد و عورت سب ہی دوبارہ جمع کئے جائیں گے اسی طرح "یاجوج و ماجوج" بھی اس چوتھے دور میں اپنے آپ کو پائیں گے کہ ایک ایک کر کے اول سے آخر تک سب اکٹھے کر لئے گئے ہیں۔

ہے اس کے بڑے حصے سے ارباب تنقید و تحقیق مطمئن نہیں ہیں لیکن ایک دو روایتیں اس مسئلہ کی بخاری جیسی معتبر کتابوں میں جو ملتی ہیں ان سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے کہ یاجوج و ماجوج کے خروج کے زمانہ میں کاروبار کے لحاظ سے دنیا کے عام تمدنی و عمرانی مشاغل میں کسی قسم کا کوئی خاص تغیر و انقلاب رونما نہ ہوگا۔ آخر حضرت ابو سعید خدری صحابی ؓ کی یہ مشہور روایت کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے:

لیحجن البیت ولیعتمرن بعد خروج یاجوج و ماجوج (بخاری)

"لوگ بیت اللہ (کعبہ) کا حج بھی یاجوج و ماجوج کے نکل پڑنے کے بعد کرتے رہیں گے اور عمرہ بھی۔"

کا مطلب یا مزید اضافے کے ساتھ یہی روایت بخاری کے سوا دوسری کتابوں میں جو پائی جاتی ہے۔ یعنی:

ان الناس لیحجون و یعتمرون و یغرسون النخل بعد خروج یاجوج و ماجوج (فتح الباری)

"لوگ یاجوج و ماجوج کے نکل پڑنے کے بعد حج بھی کرتے رہیں گے اور عمرہ بھی اور نخلستان (باغ) بھی لگاتے رہیں گے۔"

بتایا جائے کہ اس سے اور کیا سمجھا جائے؟

یقیناً حج و عمرہ یا غرس نخل (نخلستان لگانا) ان کا ذکر بطور مثال فرمایا گیا ہے مقصد بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب حج و عمرہ جیسے عبادات جن کے لئے طویل و طویل مسافتوں کو طے کر کے لوگوں کو مکہ معظمہ پہنچنا پڑتا ہے اور نخلستان جن کے لگانے کا ارادہ وہی کر سکتے ہیں جن کے سامنے پر امید مستقبل ہو ورنہ قیامت کی دست تجربوں میں جب:

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ

کی کیفیت دماغوں پر مسلط ہوگی بھلا باغ و راغ کی گنجائش ہی کیا رہ جائے گی اور سچ تو یہ ہے کہ نیند سے بیدار ہو کر ایسی حالت میں رسول اللہ ﷺ کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ فرما رہے تھے:

فتح الیوم من ردم یاجوج و ماجوج مثل ھذہ۔

"یاجوج و ماجوج والے بند میں اس کے ایسا سوراخ آج کھول دیا گیا ہے"

مثل ھذہ (یعنی ایک سوراخ) کو بتاتے ہوئے "عقد انامل" کی اصطلاح میں!

آنحضرت ﷺ نے سمجھایا تھا مطلب یہ تھا کہ بہت ہی باریک سوراخ گویا اس بند میں آپ کو دکھایا گیا تھا۔

بہر حال اس مشہور روایت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ گویا اس کی اطلاع دے چکے تھے کہ یاجوج و ماجوج کی قومی زندگی کے تیسرے دور کے ظہور کے امکانات آپ ہی کے زمانے میں قریب آ چکے تھے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر کوئی کہنا چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ ظہور کے آغاز کی کرن گویا عہد نبوت میں پھوٹ چکی تھی۔ ❶

پس عام طور پر "یاجوج و ماجوج" کے خروج کو قیامت کے علامات میں جو شمار کیا جاتا ہے تو زیادہ سے زیادہ اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ یہ اسی قسم کی علامت ہے جیسے خود رسول اللہ ﷺ کی بعثت کو بھی قیامت کے شرائط و علامات میں شمار کیا جاتا ہے اور سچ پوچھئے تو یاجوج و ماجوج کا خروج کے بعد آخری انجام جو ہوگا جن روایتوں میں اس دردناک انجام کی تفصیل کی گئی ہے لوگوں نے ان کو خروج سے متعلق کر دیا' آئندہ اس کی تفصیلی بحث آ رہی ہے۔

بہر حال یہ مسئلہ کہ خروج کے سازو سامان اور زمین کی تیاری کا کام عہد نبوت میں جو شروع

❶ کہہ چکا ہوں کہ یاجوج و ماجوج کے خروج کے اس واقعہ کو ذوالقرنین والی دیوار کے انہدام و اتصال سے کوئی تعلق نہیں ہے' حضرت الاستاذ کشمیری کی تحقیق اسی باب میں نقل کر چکا ہوں۔ ایسی صورت میں آنحضرت ﷺ کا نیند سے بیدار ہو کر یہ فرمانا کہ "یاجوج و ماجوج والے ردم (بند) میں اتنا سوراخ ہو چکا" اس کا مطلب بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ رویا اور خواب میں یاجوج و ماجوج کے خروج کی ابتداء کا تمثل دیوار کے سوراخ کی شکل میں ہوا' لیکن ظاہر ہے کہ خواب میں وہ جو دیکھا جاتا ہے اور مطلب اس کا علم ہوتا ہے' قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ قحط مصر خشک خوشوں اور دبلی پتلی گایوں کی شکل میں دکھایا گیا۔ بہر حال اس روایت سے یہ سمجھنا کہ واقعی یاجوج و ماجوج والے اسی دیوار میں سوراخ کرنے پر وہ قادر ہو گئے تھے جس کے متعلق قرآن میں اطلاع دی گئی ہے کہ نقب لگانا اس میں ان کے بس کی بات نہ تھی' حقائق و واقعات سے ناواقفی ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

ہو چکا تھا۔ اس کی تکمیل کا وقت بھی آیا کوئی متعین کیا گیا ہے؟ اس سورۃ الانبیاء کی آیت

حَتّٰى إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ۔

تا آنکہ کھول دیئے گئے یاجوج ماجوج اور ہر حدب سے تیز چلتے ہوئے وہ نکل پڑے''

کے آخری ٹکڑے میں ''وهم من كل حدب ينسلون'' میں اگر غور کیا جائے اور یہ سوچا جائے کہ زمین کے وہ حصے جو پانی سے مکشوف اور نمایاں ہوئے ہیں جن میں حدبیت ([illegible] پستی اور ابھار) پایا جاتا ہے، گویا حاصل یہی ہوا کہ زمین کے سارے معمورہ میں پھیل پڑیں گے اور اس طور پر پھیل پڑیں گے کہ ان کی آمد کا یہ سلسلہ جاری رہے گا اور بڑی تیزی کے ساتھ زمین کے آباد حصوں پر یہ چھا جائیں گے تب سمجھا جائے گا کہ عہد نبوت میں جس خروج کے سوراخ پیدا ہوا تھا وہ مکمل ہو گیا اور ''فتحت ياجوج و ماجوج'' (کھول دیئے گئے یاجوج و ماجوج) کی قرآنی پیشین گوئی تکمیلی شکل میں سامنے آ گئی۔ اسی لئے حضرت الاستاذ مولانا انور شاہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کا خیال یہ تھا کہ یاجوج و ماجوج کے خروج کا واقعہ صرف پیش آنے والا ایک واقعہ نہیں ہے بلکہ:

لهم خروج مرة بعد مرة (فیض الباری شرح بخاری ج ۴ ص ۲۳)

''ان کے خروج کا یہ واقعہ کئی دفعہ پیش آتا رہے گا''

یہ عجیب بات ہے کہ ''نیا عہد نامہ'' یعنی انجیل کے نام سے جو مجموعہ کتب مشہور ہے اس میں ایک چھوٹا رسالہ بالکل آخر میں ''یوحنا عارف کا مکاشفہ'' کے نام سے بھی شریک ہے۔ کتاب کی ابتدائی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ یوحنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری ہیں اور ان کو یہ غیبی مکاشفات ہوئے ہیں جنہیں قاصد کے ذریعہ ساتوں کلیسا کے نام ایک ایک نسخہ روانہ کیا گیا تھا۔ بہرحال آئندہ پیش آنے والے واقعات ہی سے زیادہ تر ان مکاشفوں کا تعلق ہے۔

منجملہ دوسرے مکاشفات کے ایک مکاشفہ کے الفاظ یہ ہیں

''پھر میں نے آسمان کو کھلا ہوا دیکھا اور کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سفید گھوڑا ہے اور اس پر ایک سوار ہے جو سچا اور برحق کہلاتا ہے اور وہ راستی کے ساتھ انصاف اور لڑائی کرتا ہے اور اس کی آنکھیں آگ کے شعلے ہیں اور اس کے سر پر بہت سے تاج ہیں

بولی سے پایا جاتا ہے گوگ و میگوگ یا گوگ و ماگوگ یاجوج و ماجوج کے سوا اسی کے قریب ہندوستان کی بعض قدیم کتابوں میں یہی لفظ کوک وکوک کی شکل میں بھی بعضوں کو ملا ہے لیکن مذاہب کی ان پیشگوئیوں کے متعلق یہ عام دشواری تقریباً مشترک ہے کہ واقعہ جب تک سامنے نہ آجائے پیشگوئیوں کے الفاظ سے واقعہ کے تمام صحیح خط و خال سامنے نہیں آتے۔ رسول اللہ ﷺ کے مشہور صحابی حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ آئندہ پیش آنے والے واقعات کے بڑے خبردار کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو امین بنایا تھا۔ عہد صحابہ میں جب اس نوعیت کی کوئی بات دریافت طلب ہوتی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بخاری و مسلم وغیرہ صحاح کی کتابوں میں آئندہ پیش آنے والے واقعات کے متعلق جن کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے سنا تھا ایک بڑے پتے کی بات نقل کی گئی ہے۔ ماحصل جس کا یہ ہے کہ واقعہ جب پیش آتا تب فرماتے کہ مجھے یاد آتا ہے کہ یہ تو وہی بات ہے جس کا تذکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کیا تھا۔ پیشگوئیوں کے اس خاص پہلو کو مثال سے سمجھاتے ہوئے وہی یہ بھی فرماتے تھے کہ حالت یہ ہوتی ہے کہ:

کما یذکر الرجل وجه الرجل اذا غاب عنه ثم اذا راٰه عرفه (مشکوٰۃ)

"جیسے کسی ایسے آدمی کے چہرے کا جو غائب ہو کوئی خیال کرے پھر جب اس کو دیکھے تو اس کو پہچان لے۔"

جس کا بظاہر مطلب یہی ہے کہ کسی شخص کے حلیہ اور اس کے چہرے کے خصوصیات کا ذکر کسی نے سنا ہو اور وہی آدمی جب اس کے سامنے آجائے تو پہچان لے۔ پیش آنے سے پہلے پیشگوئیوں کی کچھ یہی نوعیت ہوتی ہے۔ اسی لئے پیشگوئیوں کی تعبیر جن الفاظ میں کی جاتی ہے ان سے اصل حقیقت کی تعیین اس وقت تک ممکن نہیں جب تک واقعیت کا قالب اختیار کر کے واقعہ خود سامنے نہ آجائے۔ ❶

---

❶ اور پیشگوئیاں تو خیر پیشگوئیاں ہی ہوتی ہیں۔ اپنا ذاتی تجربہ تو یہ ہے کہ الفاظ سے یوں بھی مشاہدات سے پہلے کسی چیز کی اصل حقیقت کے متعلق صحیح رائے قائم کرنا آسان نہیں ہے۔ خاکسار بچپن سے صفا و مروہ کا ذکر سنتا چلا آتا تھا پھر خود بھی جانتا ہے کہ کتنی کتابوں میں مجھے پڑھایا گیا کہ حج کے دوسرے (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

ہیں اور اپنے اپنے رجحان کے مطابق لوگوں نے خیالات ظاہر کئے ہیں۔

علامہ شوکانی نے مشہور مفسر ابن عباس کے حوالے سے اسی لئے نقل کیا ہے۔

'هذه الاية مشكلة (جلد ۳ ص ۳۱۲)

"یعنی مذکورہ بالا آیت مطلب کے لحاظ سے کافی دشوار ہے"

دشواری کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ارباب تفسیر کو کوئی ایسی صحیح روایت نہیں مل سکی جس کی روشنی میں کسی پہلو کو وہ متعین کر سکتے ہوں۔ اسی لئے قرائن و قیاسات سے مدد لے کر مختلف بزرگوں نے کسی خاص پہلو کو متعین کرنا چاہا ہے۔ اسی سلسلہ میں ابو عبیدہ، ابو علی فارسی وغیرہ جیسے لغت اور عربیت کے جلیل ائمہ کا نام لیا جاتا ہے۔ میرے لئے نہ یہ ممکن ہے اور نہ ضرورت ہے کہ سوال و جواب کے اس تمام سلسلے کا یہاں ذکر کر کے ہر ایک کی تنقید کرتے ہوئے اپنے ذاتی احساس کو پیش کروں کیونکہ اس طویل عمل کے بعد بھی میری رائے اور میرے خیال کی حیثیت بھی منجملہ دوسرے احتمالات کے ایک احتمال ہی کی رہے گی۔ میں خود قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا تھا کہ جس پہلو کی طرف میرا ذہن منتقل ہوا ہے اس کی نوعیت کیا ہے؟ بالکل ممکن ہے کہ اس مسئلہ میں بھی میرے احساس کا حشر وہی ہو جو صفا و مروہ والے غریب احساس کا انجام اصل حقیقت کے سامنے آنے کے بعد ہوا۔ جس کا تذکرہ میں نے نوٹ میں کیا ہے۔

یاجوج و ماجوج کون ہیں؟

کچھ بھی قرائن اور قیاسات ہی کی مدد سے میرا ذہن بھی ایک نتیجہ تک پہنچا ہے اسی کو پیش کر دیتا ہوں اس بات میں خود قرآن مجید کے عام طریقہ تعبیری سے کم از کم اپنے نزدیک میں اپنے آپ کو متاثر پاتا ہوں۔ آپ قرآن مجید کی تلاوت شروع کیجئے دیکھئے گا کہ یہودیوں کی وہ نسل جو نزول قرآن کے زمانہ میں پائی جاتی تھی ان ہی کو خطاب کر کے ان کی طرف ان کی گزشتہ نسلوں کے اچھے اور برے کارناموں اور کرتوتوں کو منسوب کرتا چلا جاتا ہے۔ اور جن نعمتوں اور نوازشوں سے ہزار ہا ہزار سال پہلے ان کے آباؤ اجداد سرفراز ہوئے تھے ان کو بھی نزول قرآن کے وقت پائے جانے والے بنی اسرائیل کی طرف منسوب کر کے احسان جتلایا گیا ہے۔

قرآنی تعبیر کی یہ ایسی خصوصیت ہے جس کے لئے مثالوں کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں جس کا جی چاہے قرآن کھول لے۔ تیسرے چوتھے ورق سے خطاب کا یہ خاص طریقہ مسلسل اس کے سامنے گزرتا چلا جائے گا۔ طریقہ خطاب و تعبیر کے اس خاص اسلوب کا حاصل یہی تو ہے کہ بجائے انفرادی شخصیتوں کے اجتماعی وحدت کو سامنے رکھ کر افعال و اعمال، صفات و حالات کو منسوب کرنا قرآن کا عام پیرایہ بیان ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا اور دوسری بات جو بنی اسرائیل ہی کی متعلقہ آیتوں سے سمجھ میں آتی ہے مثلاً سورۂ بنی اسرائیل میں بنی اسرائیل ہی کو خطاب کر کے:

إِنْ عُدْتُمْ عُدْنَا۔

"اگر تم واپس ہو جاؤ تو ہم بھی واپس ہوں۔"

جو فرمایا گیا ہے کہ عود اور واپسی کے اس عام قانون کا ذکر کرتے ہوئے اسی قوم کے ساتھ یہ تاریخی حادثہ جو پیش آیا تھا کہ بعض زور آور (اولی باس شدید) قوموں نے ان کو برباد و ہلاک کر دیا تھا اور پھر یہودیوں کو دوبارہ سنبھال لینے کا موقع عطا کیا گیا جس کے آثار و نتائج کو بتاتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

أَمْدَدْنَاكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا۔

"ہم نے مال و دولت اور اولاد کے ذریعہ سے تمہاری مدد کی اور تم کو بنا دیا ہم نے بڑی تعداد والی قوم۔"

ظاہر ہے کہ زور آور قوموں کے تباہ و برباد ہونے والی اسرائیلی نسل کا وہ طبقہ اس طبقہ سے یقیناً مختلف تھا، جن کو اپنی پرانی عظمت و شوکت، دولت و امارت، قوت و طاقت کی طرف واپس ہونے کا موقع ملا تھا، لیکن قرآن نے بربادی اور تباہی کو جس طرف منسوب کیا ان ہی کی طرف عظمت رفتہ کی واپسی کو بھی اس نے منسوب کیا ہے۔

ان دو تمہیدی مقدمات کے بعد اگر یہ سمجھا جائے کہ یاجوج و ماجوج سے تعلق رکھنے والی مذکورہ بالا آیت میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ ہلاک شدہ آبادی کو واپس پلٹنے کا موقع اس وقت تک حاصل نہ ہوگا۔ جب تک یاجوج و ماجوج نہ کھول دیے جائیں اس کا اگر یہ مطلب سمجھا جائے کہ

رفتاری کے ساتھ چل نکلی ہے۔"

اور غور کیجیے کہ تفسیر کا ذہن جس پہلو کی طرف منتقل ہوا ہے وہ بھی قرآنی بیانات اور قرآن کے قدیم طریقۂ تعبیر و طرز ادا سے اس کی کس حد تک تائید ہوتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم و احکم۔

تاہم باوجود ان تمام منطقی تشریحات کے ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ قرآنی آیات کی روشنی میں ہم تمام اور کسی تعیین کے ساتھ ان قوموں کو متعین نہیں کر سکتے جن کو قرآن نے یاجوج و ماجوج کی تعبیر میں داخل کیا ہے۔ مذکورہ بالا قرآنی آیتوں کو ہم پیوند کر کے دیکھنے کے بعد بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ ایک ٹوپی ضرور تیار ہو گئی ہے اب یہ آپ کا اور ہمارا کام ہے کہ قوموں کے سروں پر رکھ کر دیکھیں کہ یہ ٹوپی ٹھیک کس کے سر پر بیٹھ جاتی ہے۔ اس میں غیر قرآنی چیزوں سے کچھ مدد بھی اگر لی گئی تو ان کی حیثیت معاون و ثانوی کی ہے لیکن جو بنیادی نکتے ہیں وہ صرف قرآن سے حاصل کئے گئے ہیں۔

دعویٰ "مہدویت" و "مسیحیت"

واقعہ یہ ہے کہ پچھلے دنوں بعضوں کی طرف سے "یاجوج و ماجوج" کے معاملے سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی انتہائی کوششوں میں غیر معمولی سرگرمیاں عمل میں آئیں اور "یاجوج و ماجوج" اور "مسیح الدجال" کے تصور کو اچھال اچھال کر خواہ مخواہ یہ ہنگامہ برپا کر دیا گیا کہ مہدی اور مسیح ابن مریم کی آمد کا وقت آ گیا۔ اسی ہنگامے میں اس دعویٰ کا اعلان کر دیا گیا کہ مسلمانوں کا مہدی اور عیسائیوں کا مسیح ابن مریم آ گیا۔ سادہ لوحوں کا ایک طبقہ اس عجیب و غریب دعوے کی طرف متوجہ بھی ہو گیا اور انتظار کرنے لگا ان کارناموں کے ظہور کا جن کے بغیر نہ مہدی مہدی اور نہ مسیح ابن مریم بن سکتے ہیں لیکن انتظار کرنے والے عجیب انتظار ہی کرتے رہے اور مہدی اور مسیح بن کر اپنے آپ کو پیش کرنے والے صاحب دنیا سے تشریف بھی لے گئے۔ لیکن واقعات ان کے سامنے بھی اور ان کے چلے جانے کے بعد بھی مہدی اور مسیح کے کارناموں کے برعکس ہی پیش آتے رہے اور پیش آتے چلے جا رہے ہیں۔ انتظار کرنے والوں کا یہ مسکین طبقہ اب حیران ہے

کہ جس دجال کا شکار ان کو بنا لیا گیا تھا اس کی توجیہ کیا کرتے حالانکہ مستقبل کی تاریخ میں پیش آنے والے جن حوادث و واقعات کا ذکر دینی وثائق میں بطور آثار قیامت کیا گیا ہے کاش ان سے متعلق یہ بنیادی بات ان کے دل میں نہ بیٹھ جاتی کہ یہ سارے واقعات ایک ساتھ زمانہ کے کسی محدود حصہ میں اچانک پیش آ جائیں گے۔ یہ فیصلہ قطعاً عاجلانہ اور عامیانہ فیصلہ ہے۔ اور اصل حقیقت وہی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سیدنا الاستاذ الامام مولانا انور شاہ الکشمیری فرمایا کرتے تھے۔ ان کی امالی شرح فیض الباری میں بھی ہے۔

الا تری ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم عد من اشراط الساعۃ قبضہ من وجہ الارض وفتح بیت المقدس و فتح القسطنطنیۃ فہل تراہا متصلۃ وبینہا فاصلۃ متفاصلۃ (فیض الباری شرح بخاری)

"کیا تم نہیں دیکھتے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود اپنی وفات کو بھی قیامت کے شرائط میں شمار فرمایا ہے اور ان ہی شرائط قیامت میں بیت المقدس اور قسطنطنیہ کی فتح کے واقعات بھی ہیں پھر کیا یہ سارے واقعات باہم ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں یا ان کے درمیان غیر معمولی فاصلے ہیں۔"

بہرحال یاجوج و ماجوج کے کھل جانے کے ساتھ ہی خواہ مخواہ مہدی اور مسیح کی تلاش کا جو جذبہ عوام میں جو بھڑکا دیا گیا سچ پوچھئے تو آپ "بڑی حقیقت" شورش اور ہنگامے کے اس طوفانی گرد و غبار میں دب کر رہ گئی ورنہ بقول الاستاذ الامام الکشمیری واقعہ کی اصل صورت یاجوج و ماجوج کے متعلق یہی تھی کہ:

انہم خرجوا مرۃ بعد مرۃ وقد خرجوا قبل ذلک ایضاً و افسدوا فی الارض بما یستعاذ منہ ثم یکون لہم الخروج الموعود فی آخر الزمان و ذلک اشدہا

"اچانک ایک دفعہ وہ پل پڑیں گے ایسا نہیں ہے بلکہ بار بار نکلتے رہیں گے آخر پہلے بھی تو وہ نکلے اور زمین میں وہ گڑبڑ مچائی کہ اللہ اپنی پناہ میں اس سے رکھے ہاں! آخر زمانہ میں بھی ان کے نکلنے کا وعدہ کیا گیا ہے اور ان کا یہ خروج سب سے زیادہ

دوسرا جز یعنی روس کے علاوہ برطانیہ والوں کا بھی یاجوج وماجوج والوں کی نسل سے ہونا
چوں کہ ایک تاریخی مسئلہ ہے اور شروع ہی سے عرض کرتا چلا آ رہا ہوں کہ بصورت اس مضمون
میں کسی ایسے مسئلہ کا حتی الوسع میں ذکر نہیں کروں گا جس کی حیثیت صرف تاریخی ہو یہ کام ارباب
تاریخ کا ہے اور اپنی معلومات کی روشنی میں جو ہیں تو اس مسئلہ کی تحقیق وہ کر سکتے ہیں۔ ❶

اور سچ تو یہ ہے کہ جیسے ''مسیح الدجال'' کے متعلق میں نے عرض کیا تھا کہ بجائے ذات کے
اصل ضرورت اس کی ہے کہ ان ''دجالی صفات'' کا پتہ چلایا جائے جن کی وجہ سے ''دجال'' دجال
بن جائے گا اور اسی طرح یہ ڈھونڈنا کہ دنیا کی کن قوموں کو یاجوج وماجوج قرار دینا چاہیے ایک
غیر ضروری تاریخی مسئلہ سے زیادہ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ اس سلسلہ میں بھی بجائے ذات
کے ہمیں ان صفات ہی پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیے جس کی وجہ سے مذاہب وادیان میں یاجوج
وماجوج سے بچو کنارہ رہنے پر اصرار کیا گیا ہے۔

☆☆☆

---

❶ یورپ کی قوموں کے سب ناموں اور بے شمار نام کے قبائل ان میں جو پائے جاتے تھے ان سے واقفیت
کے سوا اس مسئلہ میں ایسی باتیں کہ انگلستان کے شہر کیمبرج میں (؟) ماجوج نامی کوئی پہاڑی پائی جاتی ہے یا ہر
سال انگلستان میں ''گاگ میگاگ'' یعنی یاجوج و ماجوج کا میلہ تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے چلا آ رہا ہے یا شہر
لندن میں گلڈ ہال نامی جو عمارت ہے جو شہر لندن کا پورشن کا صدر مقام ہے اسی عمارت میں جا بجا اس کے دروازے
پر گاگ و میگاگ یعنی یاجوج و ماجوج کی دیوار پیکر تصویریں سامنے جو عزیزی کی گئی تھیں۔ یہ کس ذہنی طرف اشارہ
ہے۔ اسی قسم کے بیسیوں قصوں کو تاریخ کے علما اپنی بحث و تحقیق کا موضوع بنا کر نتیجہ تک پہنچ سکتے
ہیں۔ یہ مضمون کی حد تک میرے لئے تو چند اشارے ہی کافی ہیں۔

معبودوں ہی کے ساتھ سہی لیکن بہرحال عالم کے خالق کی یاد سے کوئی قوم خالی نظر نہیں آتی۔ پھر اس احساس کا یہ حصہ "یعنی وہ دوسروں کا بھی (میرے ذکر کا) برداشت نہیں کرسکتے"

دیکھ لیجئے کہ ذکر اللہ کے سننے کی بھی آج جو برداشت نہیں کرسکتے وہ کون لوگ ہیں؟ ان کی تقریروں میں، تحریروں میں تلاش کیجئے ہر چیز کے ذکر کے ساتھ جس کے ذکر سے وہ خالی نظر آئیں گے کیا یہ سچ پیدا کرنے والے خالق پروردگار حق کا ذکر ہوگا؟" اس باب میں اس کی نفرت کا درجہ استہزاء و تمسخر کے حدود تک کن لوگوں میں پہنچ چکا ہے؟ کیا اس کے لئے کسی ریسرچ اور تجسس کی ضرورت ہے؟

رپٹ لکھوائی ہے یاروں نے جا جا کر یہ تھانے میں
کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

اکبر مرحوم کا یہ شعر آج جو زبان زد عام بنا ہوا ہے کیا یہ کوئی اتفاقی بات ہے یا ان کی اس ظرافت میں کوئی حقیقت پوشیدہ نہیں ہے؟

این سخن را چہ جواب است تو ہم میدانی

خدا کے بجائے بندوں پر اعتماد:

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

أَفَحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ يَتَّخِذُوا عِبَادِي مِنْ دُونِي أَوْلِيَاءَ إِنَّا أَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ نُزُلًا ۝

"کیا وہی لوگ جنہوں نے انکار کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ بنا لیں میرے بندوں کو میرے سوا اپنے پشت پناہ۔ ہم نے تیار کر رکھی ہے جہنم ان کی مہمان نوازی کے لئے"

خالق عالم حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کی یاد و ذکر سے قلبی انحراف اور بغاوت کے بعد فطرت انسانی کے ایک خاص رجحان کی طرف ایک خاص قسم کا اشارہ سمجھنے سے آپ کو اس آیت میں مل سکتا ہے کہ اہتمام خاکسار کا ناچیز احساس یہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے خالق کی عائد کی ہوئی آگہی کی ذمہ داریوں سے بچ نکلنے یا نکل بھاگنے کا زندگی کے موجودہ ابتدائی

مجبوری دوری میں یہ ایک آسان طریقہ ہے کہ خالق سے اپنا رشتہ توڑ لیا جائے اور "خدا کو کیا پڑی میرے تمہارے درمیان کیوں ہو" کہتے ہوئے جو جی میں آئے آدمی کرتا چلا جائے۔ عموماً الحاد کی زندگی کے نیچے بھی اسی قسم کی شعوری و غیر شعوری ذہنی چالاکیاں اور بے باکیاں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ الحاد اور بے دینی کی زندگی کا ایک پہلو تو یہ ہے لیکن اسی کے ساتھ انسان جو سراسر احتیاج اور اپنے خاص حالات کے لحاظ سے صرف فقر اور کہئے تو کہہ سکتے ہیں کہ مجسم بھیک اور صرف سوال ہی سوال کے سوا اور کچھ نہیں ہے' اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی بیرونی امداد کے بغیر وہ بسر نہیں کر سکتا' کھانے پینے اور پہننے حتیٰ کہ سانس تک لینے میں غیر کی محتاجی غریب آدمی کی زندگی کا ایسا کھلا ہوا خاصہ ہے جس سے قطع نظر کرنے کی صورت ہی نہیں۔ وہ بیمار پڑتے ہوتے جس علاقہ میں رہتا ہے وہاں موقع بہ موقع پھوٹ پڑتی رہتی ہیں' قحط' خشک سالی کے قصے ہوتے رہتے ہیں' جنگوں کا خلفشار چھڑا رہتا ہے' آگ لگی اور بدامنی کا دور دورہ شروع ہو جاتا ہے' یہ اور اسی قسم کے پیش آنے والے حوادث و واقعات کے مقابلہ میں کیا کیا جائے؟ ایک سوال ہے جو تاریخ کے معلوم زمانے سے بنی آدم کے دل و دماغ میں ہل چل مچاتے ہوئے ہے۔ خالق عالم کی طرف توجہ کی جائے اور اسی کی پشت پناہی یا رعایت میں اپنی زندگی کو ڈال دیا جائے' یہ حل تو اس سوال کا بظاہر آسان نظر آتا ہے' لیکن اسی کے ساتھ انسان جس نصب العین کی تکمیل کے لئے پیدا کرنے والے نے پیدا کیا ہے اس کی ذمہ داریاں اس راہ میں قدم بقدم عائد ہو جاتی ہیں' قرآن میں اس کا اعلان کرتے ہوئے کہ،

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۔

"میرے بندے جب پوچھیں میرے متعلق تو کہہ دو کہ میں قریب اور پاس ہی رہتا ہوں اور پکارنے والوں کی پکار کا جواب دیتا ہوں"

آگے جو یہ فرمایا گیا ہے کہ:

فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ۔ (البقرہ)

"ان کو چاہئے کہ وہ بھی مجھے جواب دیں اور مجھے مانیں تاکہ وہ سیدھی راہ پر چل پڑیں۔"

اس میں کارروائی کے اسی دوسرے پہلو کی طرف رہنمائی فرمائی گئی ہے۔ حاصل یہی ہے کہ
مجھ سے کچھ لینا چاہتے ہو تو جو کچھ مجھ سے میں چاہتا ہوں اسے تم بھی تو پیش کرتے رہو "لعلھم
یرشدون" تا کہ وہ سیدھی راہ پر چڑھ جائیں کا مطلب یہی ہے۔ دانائی کا فطری طریقہ یہی ہے
لیکن جو خود سب کچھ لینا چاہتے ہوں مگر خود کسی قسم کی ذمہ داری اپنے اوپر اپنے پیدا کرنے والے
کی خاطر نہیں چاہتے ان میں ایک طبقہ تو ان لوگوں کا ہے جنہوں نے خالق عالم اور اپنے درمیان
"آلہہ" یعنی دیوتاؤں اور مخلوق معبودوں کا ایک سلسلہ فرض کر رکھا ہے۔ شعور اس کا ان کو ہو یا نہ ہو
لیکن واقعہ یہی ہے کہ اس تدبیر سے اپنی کاربرآریوں کی ایک ایسی راہ اپنے خیال صرف خیال
میں انہوں نے نکال لی ہے جس میں ان کے زعم یا وہم کے مطابق ان کی ضرورتوں کی تکمیل کا تو
انتظام ہو جاتا ہے مگر خود ان پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ صرف ان درمیانی وسائط و مخلوق
معبودوں کے متعلق ان کا احساس ہوتا ہے کہ نذر و نیاز وغیرہ چڑھاوے کی قسم کی چیزوں سے
خوش ہو کر ہماری حاجتوں کو پورا کرتے ہیں "آلہہ" یا دیوتا پوری کر دیتے ہیں لیکن ان کے معبودوں
کی طرف سے کسی قسم کا کوئی اخلاقی مطالبہ ان پر عائد نہیں ہوتا۔ غرض ان کی ذمہ داری ہوتی بھی
یہی ہے کہ اخلاقی ذمہ داری کے بغیر ان کی ضرورت پوری ہوتی رہے۔ اپنے ان معبودوں کی نذر و
نیاز کے سلسلے میں کچھ قرار رقم صرف کر دینا ان کو اس سے زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے کہ اپنے
آپ پر اور اپنے نفس کی خواہشوں پر پابندیاں عائد کریں۔ یہ مشاہدہ کی بات ہے کہ شرکانہ
کاروبار کرنے والوں میں کسی قسم کی ایسی اخلاقی اور آئینی ذمہ داری جو ان کے دیوتاؤں کی طرف
سے ان پر عائد کی ہو، اس کا احساس نہیں پایا جاتا۔ خواہ ان معبودوں کی پوجا پاٹ میں ان کا جتنا
بھی خرچ ہو جائے۔ گویا خدائی ذمہ داریوں کے احساس کو دبانے کی یہ ترکیب اس طبقہ نے نکالی
ہے کہ خدا کے سامنے انہیں آنا ہی نہ پڑے بلکہ خود تو وہ اپنے خود تراشیدہ معبودوں کے سامنے
جو کر کھڑے ہوتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ان کے معبودوں سے چونکہ خدا راضی ہے اس
لئے ان درمیانیوں سے ان کی ضرورتوں کی تکمیل وہ کرا لیں گے۔

اس طریقہ کے مقابلہ میں ایک دوسری تدبیر یہ بھی ہے کہ خدا کے سامنے سے تو اپنے آپ کو
مطلق العنان اور آزاد رکھنے کے لئے وہ بھاگ جاتے ہیں یعنی بھول کر بھی نہ خدا کا نام لینا چاہتے

ہیں اور شاذ ان کو وہ یاد ہی آتا ہے۔ باقی زندگی کی ضرورتوں اور حاجتوں کے لئے مشرکوں کے
ہاں یہ خود تراشیدہ اور ان کے خیال کے مطابق خدا رسیدہ معبودوں کی جگہ انہوں نے ہر ضرورت
و حاجت کے لئے نئی خلاق یا ٹیکنیکل ایکسپرٹوں کا وہ طبقہ کھڑا کر لیا ہے جس کی تعلیم و تربیت پر
اس سے زیادہ توجہ اور زیادہ خرچ کرتے ہیں جتنی توجہ اور جتنے مصارف کا بار مشرکانہ کاروبار
والے اپنے معبودوں کو راضی رکھنے کے لئے برداشت کرتے ہیں اور ہر پیش آنے والی ضرورت
کے لئے وہ ان ہی خلاق اور ایکسپرٹوں کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ ان ہی کی ولایت اور پشت
پناہی میں ان کی ساری زندگی بسر ہوتی ہے۔ کسی ایسی جگہ تو یہ ان کے لئے دوبھر بلکہ شاید ناقابل
تصور ہوتا ہے جہاں اپنے ان اولیاء یا پشت پناہوں کے دست یاب ہونے میں کسی قسم کی دشواری
کا خطرہ ہو۔ ان ہی ایکسپرٹوں کے ساتھ ساتھ ایک طبقہ ان میں لیڈروں اور قائدوں کا بھی ہوتا
ہے اور عموماً اجتماعی معاملات میں ان ہی پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ الغرض خدا کی ذمہ داریوں سے
بچتے ہوئے ضرورتوں اور حاجتوں کی تکمیل میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ پیش آنے پائے اس کے لئے ان
ہی مذکورہ بالا دو طریقوں میں سے کسی ایک یا دونوں کو ساتھ ساتھ اختیار کرنے والوں نے اختیار
کر رکھا ہے۔ قرآن میں مشرکانہ کاروبار والوں کے طرز عمل کی تعبیر کے سلسلے میں عموماً اس قسم کے
الفاظ پائے جاتے ہیں۔ مثلاً

اِتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اٰلِهَةً۔

"انہوں نے میرے سوا معبود بنا لئے ہیں"

خلاصہ یہ ہے کہ اپنی ضرورتوں اور حاجتوں میں جن پر مشرکین بھروسہ کیا کرتے تھے اور جن
کی طرف اس راہ میں رجوع ہوتے تھے ان کو آپ دیکھیں گے۔ عموماً "آلھۃ" کے نام سے
قرآن موسوم کرتا ہے لیکن سورۂ کہف کی مذکورہ بالا آیت میں بجائے اس کے ہم "عبادی من
دونی اولیاء" کے الفاظ پاتے ہیں یعنی یہاں بجائے "آلھۃ" کے "اولیاء" کا لفظ
استعمال کیا گیا ہے اسی کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مشرکوں کے تمام معبودوں اور الٰہ کے
متعلق قرآن میں یہ جتلایا گیا ہے کہ عموماً وہ نام ہی نام ہوتے ہیں لیکن ان ناموں اور اسماء کو مسمّی
سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، یعنی کہ درحقیقت ان ناموں سے جن چیزوں کی تعبیر کرتے ہیں وہ

دنیوی حیات ہی کے لئے ساری دوڑ دھوپ اور اس پر فخر:

آگے تیسری آیت جو ان تمام آیتوں میں سب سے زیادہ توجہ طلب ہونے کے ساتھ ہی مطلب کے لحاظ سے یا کم از کم میرے نقطۂ نظر کے حساب سے بہت زیادہ واضح ہے وہ یہ ہے ارشاد ہوا ہے:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝

"کہہ دو کیا ہم آگاہ کریں ان لوگوں سے جو اپنے کاروبار کے حساب سے بدترین خسارے کے شکار ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کی سعی اور کوشش کھو گئی اسی حیات دنیا (پست زندگی) میں اور وہ خیال کر رہے ہیں کہ کارستانی کے لحاظ سے وہ بہت اچھا کر رہے ہیں۔"

ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا—

"کھو گئی کوشش ان کی اسی حیات دنیا (پست زندگی) میں"

سب سے زیادہ فکر و تامل کی دعوت اس آیت کا یہی جزو دے رہا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ "الآخرۃ" کی بچی زندگی سے اپنی توانائیوں کے سارے ذخیرے کو موڑ کر قطعی طور پر موڑ کر اسی "الحیوۃ الدنیا" پست زندگی میں کون گم کر رہے ہیں اور گم کرنے پر اصرار کر رہے ہیں۔ سب کچھ کر کے اور سب کو چھوڑ چھوڑ کے اس دنیا سے ان میں کا ہر ایک بایں طور روانہ ہو رہا ہے کہ مرنے والے جو کچھ بھی پاتے ہیں کچھ بھی اپنے ساتھ نہ لے جاتے ہیں اور نہ لے جا سکتے ہیں۔ اور یوں اپنی ساری توانائیوں اور ان کے نتائج کو دن کی کھلی روشنی میں ہر ایک کے سامنے مسلسل ہر ایک کھوتا چلا جا رہا ہے۔ مگر بایں ہمہ اپنی کوششوں کی اسی ناکامی کے ساتھ مطمئن بھی ہیں اور اسی کو صحیح اور کامیاب زندگی قرار دینے پر ان کی خود ستائیوں کا سلسلہ اس حد تک پہنچا ہوا ہے کہ بنی آدم کے اکثر و بیشتر افراد پر اپنی اسی عجیب و غریب ناکام و نامراد زندگی کی پرچھائیوں کو ڈال ڈال کر عمومیت کو تقریباً اپنا ہمنوا بنانے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ الآخرۃ کا خیال اور اس خیال

واضح خصوصیت کے ساتھ موجود ہے مگر اس کا فاسد ہونا مذہب سے بے تعلقی کا حاصل عیش پرستانہ دنیوی زندگی کے ساتھ تقریباً انسانیت مطمئن ہو چکی ہے۔ اس عجیب و غریب ذہنیت کا استیلاء اپنے دائرے کو روز بروز بڑھاتا ہی چلا جا رہا ہے۔ آدمی جانور نہیں ہے جو نتیجے سے بے تعلق ہو کر زندگی بسر کرے۔ پھر عقل و تمیز رکھتا ہوا اسی ذہنیت کو روز افزوں کیوں بڑھا رہا ہے؟ اسی سوال کے جواب کو جہاں تک میرا خیال ہے ہم سورۂ کہف کی اس آیت میں پا سکتے ہیں فرمایا گیا ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ۔

"یہ وہی لوگ ہیں جو اپنے پالنے والے کی نشانیوں کے بھی منکر ہو گئے ہیں اور اس کا بھی انکار کر دیا ہے کہ اپنے رب سے ان کی ملاقات ہوگی۔"

جس مسئلہ کی طرف مذکورہ بالا الفاظ میں توجہ دلائی گئی ہے اس کے سمجھنے کے لئے ایک مثال کو پیش نظر رکھئے۔

کشتی گیری اور پہلوانی کے کمالات کا دعویٰ کر کے ایک شخص آپ کے سامنے اس طرح اپنے آپ کو پیش کرتا ہے کہ کشتی گیری اور پہلوانی کے سارے ساز و سامان سے بھی وہ لیس ہے لنگر لنگوٹ چڑھائے دنگل میں اتر کر اپنے جوڑ کے پہلوان کو پچھاڑ پچھاڑ کر بھی دکھا رہا ہے۔ دوسری طرف پہلوانی ہی کے مدعی بن کر ایک اور صاحب آتے ہیں تصورات کے بادلوں کے پاس میں جلوہ گر ہیں، پہلوانی کی کوئی علامت و نشانی اپنے ساتھ نہیں رکھتے ہیں لیکن مدعی ہیں ان ہی کمالات کے جو پہلوانی کے ساتھ مختص ہیں۔ بتائیے کہ پہلوانی کے لحاظ سے کس کا وجود آپ کے لئے دیکھا بھالا اور مانے جانے کا زیادہ مستحق ہے؟

اب اسی مثال کی روشنی میں دیکھئے کہ کائنات جس میں شجر، نباتات، جمادات، حیوانات، انسان، چاند، سورج، ستارے الغرض گوناگوں مخلوقات میں اپنی خلاقی کی کارفرمائیوں کو نمایاں کر کے خالق عالم نے اپنے آپ کو ہمارے سامنے جو ظاہر کیا ہے کیا ظہور حق کی اس شکل کے مقابلہ میں دیں کا یہ تقاضا کہ موجودہ کائناتی کمالات کے بغیر خدا ہمارے سامنے آتا تو تصور کی ان دونوں شکلوں میں کیا وہی نسبت نہیں ہے جو ان دونوں پہلوانوں میں تھی جن میں سے ایک پہلوانی کے سارے آثار اور نشانیوں کے ساتھ ہمارے سامنے حاضر ہے اور دوسرا پہلوانی کے

کمالات کا مدعی بن کر بجائے اپنے کمالی صفات کے صرف اپنی ذات کو پیش کر کے مطالبہ کرتا ہے کہ اسے پہلوان مان لیا جائے۔

کچھ ایسی ہی عجیب بات ہے کہ جن کارفرمائیوں کے کمالات کے ساتھ حق سبحانہ وتعالیٰ ہمارے سامنے موجود ہیں اور جو سچ ہیں کہ وہی کمالات جن کا قرآنی نام آیات اللہ یا اللہ کے بیّن در نشانیاں ہیں انہی آیات اور نشانیوں کے ساتھ ہم ان کو پاتے ہیں، ورنہ نہ جانے کچھ لوگ یہ حیلہ تراش کر کے کہ کمالات سے مجرد اور خالی ہو کر جب تک خدا ہمارے سامنے نہیں آتا اس لئے ہم اس کو نہیں مان سکتے۔ بھلا سوچئے کہ یہ ایک شیطانی حیلہ کے سوا بھی کچھ ہے؟ پہلوانی کے کمالات کے ساتھ پہلوان جب آپ کے سامنے تھا یا تھا اس کے پہچاننے ہونے سے آپ نے اس سے انکار کر دیا کہ ہم تو اسی کو پہلوان مانیں گے جو پہلوانی کے سارے آثار و علامتوں سے مجرد و پاک ہو کر ہمارے سامنے آجائے۔ خدا بیزاری کی عام ذہنیت میں آپ کو ایسے ہی غیر منطقی غلط مطالبے کے جراثیم کے سوا کچھ نہیں ملتے۔

آپ کو اور کچھ نظر نہ آئے تو اسی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ

”یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات اور نشانیوں کا انکار کر دیا“

یعنی کمالات رب کی ان کھلی ہوئی نشانیوں سے انہوں نے طے کر لیا ہے کہ ہم خود بھی خدا کو نہ دیکھیں گے اور نہ مانیں گے اور نہ دوسروں کو پانے اور ماننے دیں گے اور اسی بنیاد پر انہوں نے یہ بھی فیصلہ کر دیا ہے کہ آئندہ زندگی میں خالق کائنات کی ملاقات کا خیال بھی صرف خیال ہی ہے۔ یہی خود بھی باور کئے بیٹھے ہیں اور دوسروں میں بھی چاہتے ہیں کہ اپنے اسی بے بنیاد فیصلہ کو منتقل کر دیں۔ اسی دعوت کے پھیلانے اور عام کرنے میں وہ سرگرم ہیں۔

الغرض خدائی آئین کی ذمہ داریوں سے بچنے کے لئے بیزاری کا یہ غیر منطقی فلسفہ انہوں نے تراشا ہوا اور اپنی زندگی اور زندگی کے سارے کاروبار پر سے خدا اور خدا کے عقیدے کا دباؤ خود بھی اٹھا دیا ہے اور چاہتے ہیں کہ دوسروں سے بھی یہ دباؤ جس حد تک اٹھایا جا سکتا ہو اٹھا دیں چاہتے ہیں کہ ان کاموں میں بھی جن کو جانتے ہیں کہ خدا ان سے خوش ہوتا ہے ان کو بھی وہ یہ سوچ کر کرتے ہیں کہ ہم خدا کے لئے نہیں کر رہے۔ بہر حال ان کا جو قدم بھی اٹھتا ہے خدا

عیش و سکون ہی کا نظم کیوں نہ کر دیا جائے لیکن ایک ہی حال کے دوام و استمرار سے، راحت و آرام کی ایسی زندگی بھی آدمی کے لئے اجیرن ہی بن جاتی ہے۔ عموماً ہوٹلوں اور اقامت خانوں کا کھانا طلب پر اسی لئے تیار ہوتا ہے اور وہ بھی تبدیل کر دیا جاتا ہے کہ چند گنے چنے خاص کھانے کے تسلسل سے دل اکتا جاتے ہیں۔ آدمی کی فطرت کا یہی جبلی قانون اور تقاضا ہے۔ وسوسہ یہی ہوتا ہے کہ خلود و دوام کے ساتھ آدمی کی فردوسی زندگی کی لذت و سرور کا تسلسل کیسے باقی رہ سکتا ہے؟ بظاہر یہیں نئی آگاہی

﴿لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا﴾

”نہیں چاہیں گے ان باغوں سے منتقل ہونا“

کے الفاظ سے جو تشفی کی گئی ہے ان سے اسی وسوسہ کا ازالہ شاید مقصود ہے اور اس کی آیت یعنی:

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا (الکہف)

”کہہ دو! اگر ہو جائے سمندر روشنائی میرے رب کے کلمات کے (لکھنے) کے لئے تو ختم ہو جائے گا سمندر کا پانی قبل اس کے کہ ختم ہوں میرے رب کے کلمات اگرچہ لاتے ہی چلے جائیں اسی قسم کے سمندر (کے پانی) کو مدد کے لئے“

اس آیت کا دلیل اولی یا سرسری نظر میں اپنے سیاق سے بظاہر تعلق محسوس نہیں ہوتا لیکن اگر فکر معقول سے کام لیا جائے تو وہی وسوسہ یعنی فردوسی زندگی میں استمرار و دوام کی وجہ سے اکتا اور گھبرا جانے کا خطرہ فطرت انسانی کے عام اقتضاء کے مطابق دلوں میں جو پیدا ہوتا ہے اسی خطرے سے محفوظ ہونے کی ضمانت ان آیتوں میں ہم پا سکتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ انسانی احساسات لذت و سرور کو جنت کی زندگی میں جن چیزوں سے حاصل کریں گے ان کے متعلق یہ مفروضہ ہی صحیح نہیں ہے کہ ایک دفعہ جو کچھ دیا جائے گا وہی ہمیشہ ملتا رہے گا۔ سورہ بقرہ کی مشہور آیت

﴿وَكُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ

مُتَشَابِهًا

"جب کبھی کوئی پھل جنت والوں کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے یہ تو وہی ہے جو دیا گیا تھا ہمیں پہلے (حالانکہ یہ واقعہ نہ ہوگا) بلکہ بخشی جائیں گی ان کو ملتی جلتی چیزیں۔"

اس میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب کبھی جس چیز کے متعلق یہ خیال پیدا ہوگا کہ وہی بعینہ مکرر دی گئی ہے تو فوراً اس خیال کا ازالہ تجربہ سے ہو جائے گا کہ صرف صورت میں مشابہت تھی لیکن معنوی حیثیت سے کسی جنت کی کوئی چیز دہرائی نہ جائے گی۔ جہاں کا یہ کلی قانون ہو جو کہ لمساتہ لفظ کا اقتضاء ہے وہاں تکرار و اعادہ کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے ایک دن سمجھاتے ہوئے فرمایا تھا۔

ليس في الدنيا مما في الجنة شيء الا الاسماء (درمنثور)

"نہیں ہے دنیا میں جنت کی چیزوں سے کچھ بجز صرف نام"

گویا یوں سمجھنا چاہئے جنت میں جو سیب مثلاً ملے گا تو وہ بھی سیب ہی ہے لیکن ہر لحاظ سے جنت والا سیب دنیا والے سیب سے اتنا مختلف ہوگا کہ دونوں میں کہنا چاہئے صرف لفظ اور نام ہی کا اشتراک ہوگا پھر فردوسی زندگی والے سیب کی بر حقیقی نوعیت کیا ہوگی؟ اسی کی طرف

مالا عين رأت ولا اذن سمعت ولا خطر على قلب بشر۔

"نہ دیکھا کسی آنکھ نے نہ سنا کسی کان نے اور نہ خیال گزرا اس کا کسی دل میں۔"

﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ﴾ (حٰم سجدہ)

"پھر نہیں جانتا ہے کوئی جو آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لئے چھپا کر رکھی گئی ہے"

کی یہ حدیث تفسیری توضیح ہے۔ اور یہ سب بہ حقیقت قرآن ہی کی آیت

﴿لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ﴾ (یونس)

"جنہوں نے اچھے کام کئے ان کے لئے اچھا معاوضہ ہے اور "زیادہ"

کے اجمال کی تفصیل ہے اس آیت کریمہ میں "زیادہ" کے جس لفظ کو پڑھ رہے ہیں صحیح روایت و آثار میں اس کا جو مطلب بیان کیا گیا ہے وہ یہی ہے کہ فردوسی زندگی میں براہ راست

عمل کی جو خصوصیت ہے اس کی تفصیل گزر چکی یعنی خدائی ذمہ داریوں سے بھاگنے کی راہ انہوں نے یہ نکالی کہ ضرورتوں اور حاجتوں کے لئے وہ ان میں درمیانی وسائط کو آگے بڑھا دیتے ہیں اور خود ان ہی درمیانی واسطوں کو کچھ لے دے کر ان ہی کی اپنے خیال کے مطابق منت وسماجت کر کے فرض کر لیتے ہیں کہ ان کا کام نکل جائے گا۔ اور ان کے مقابلے میں ان ہی ذمہ داریوں سے گریز کی دوسری راہ یہ ہے کہ اپنے ہی جیسے انسانوں کو زندگی کے مختلف شعبوں میں ماہر اور حاذق بنا کر اپنی ساری ضرورتوں میں خدا سے قطعاً بے تعلق رہتے ہوئے ان ہی ڈاکٹروں اور لیڈروں کی ولایت پر بھروسہ کر لیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ دونوں صورتیں ہی پیدا کرنے والے سے باغیانہ انحراف اور اپنے وجود کے نصب العین کی تکمیل سے گریز ہے اس لئے درمیانی وسائط کی ولایت کی ان شکلوں کو قرآن نے مسترد کر دیا ہے۔ وہ ولایت کا وہ طریقہ جس میں اپنے اور اس کی مرضی کے پانے کی ضمانت پوشیدہ ہے اور اپنی پیدائش کے قدرتی نصب العین تک جس ذریعے سے آدمی پہنچ جاتا ہے۔ ولایت کا یہ طریقہ تو موجودہ جسمانی زندگی کی ایک ایسی ناگزیر ضرورت ہے جس سے الگ ہو کر کامیابی تک انسانی زندگی پہنچ ہی نہیں سکتی۔ زمین کی طرف رخصت کرتے ہوئے انسان اول یعنی ہمارے پدر اول کو اسی لئے یہ وصیت کی گئی تھی۔

﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (البقرة)

"پھر آتے رہیں میری طرف سے تمہارے پاس راہ بتانے والے، اس راہ بتانے والوں کے پیچھے جو چلیں گے نہ ان کو ڈر ہے اور نہ وہ کبھی گھبرائیں گے۔"

بہر حال اسی حقیقت کا اظہار جہاں تک میرا خیال ہے سورۂ کہف کی اس آخری آیت میں بھی کیا گیا ہے۔ جس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ صاف صاف لفظوں میں کہہ دیجئے کہ میں بھی تم ہی جیسا ایک آدمی ہوں قدرت نے صرف اپنے اس منشاء کے اظہار اور ترجمانی کے لئے میرا انتخاب فرمایا ہے جس کی جوہری روح اور مرکزی عنصر یہ ہے کہ خالق کائنات ہی کو ساری انسانیت کا "الٰہ" اور ہر چھوٹی بڑی دینی و دنیوی ضرورت کا مرجع و ماویٰ بنا لیا جائے اور وہی سب کا آخری ٹھکانا بن جائے۔ یعنی

﴿وَاَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾

"اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ تمہارا الٰہ (معبود) ایک ہے۔"

کا مطلب اور خلاصہ ہوا لیکن آخر میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ:

﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝﴾ (۱۱۰ الکہف)

"پھر جو امیدوار ہو اپنے پالنے والے کی ملاقات کا تو اسے چاہئے کہ کرے بھلے (اور سلجھے ہوئے) کام اور ساجھی نہ بنائے اپنے رب کی عبادت میں کسی کو۔"

جہاں تک میرا خیال ہے خالق کائنات کو صحیح معنوں میں اپنا تنہا معبود اور واحد الٰہ بنانے کے عملی طریقہ کی طرف ان الفاظ سے جو توجہ دلائی گئی اس کا حاصل بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ واقعی ذات حق کے ساتھ براہ راست رشتہ پیدا کرنے کی جن دلوں میں امنگ اور آرزو ہو ان کو اپنی دینی زندگی میں ترتیب کی پابندی پر اصرار کرنا چاہئے کہ ان کی زندگی عمل صالح کی زندگی بن جائے۔ اگرچہ عمل صالح عام لفظ ہے لیکن آگے خالق کی عبادت اور خالق کے ساتھ بندوں کو جو تعلق رکھنا چاہئے اس کا ذکر چونکہ کیا گیا ہے اس لئے مقابلۃً یہی سمجھنا چاہئے مخلوقات کے ساتھ تعلقات کو نبھاتے ہوئے خالق کی عبادت میں سرگرمی ہی صحیح نتیجے تک آدمی کو پہنچائے گی۔ گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ خالق کی عبادت (نماز روزہ) وغیرہ میں جو چوکس نظر آتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ مخلوقات کے تعلقات میں لاپرواہیوں سے کام لیتے ہیں یا اس کے برعکس مخلوقات یا حقوق العباد کو اہم قرار دیتے ہوئے خالق کے ساتھ صحیح تعلق قائم کرنے کے ذوق سے جو محروم ہیں یہ دونوں ہی طبقے انسانی سعی کی صحیح فطری راہ سے ہٹے ہوئے ہیں۔ ٹھیک راستے پر وہی چل رہے ہیں جن کی نگاہوں میں دونوں ہی کی اہمیت ہے۔

اسی کے ساتھ اگر اس نکتے پر بھی نظر رکھی جائے کہ عمل صالح کا ذکر عبادت رب سے پہلے کیا گیا ہے۔ تو بظاہر اس سے یہ اشارہ بھی مل سکتا ہے کہ بین المخلوقاتی تعلقات کو الجھا کر خالق سے رشتے جوڑنے والے غیر طبعی طریقہ عمل میں مشغول ہیں۔

یوم الجمعۃ ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۱ جنوری ۱۹۵۲ء

عند اذان العصر بمقام کہف الایمان المشہور "پلرو"

سورۂ کہف کے متعلق ایک گاؤں والوں کے واردات و احساسات پورے ہوتے ہیں

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم ۝ ربنا لا تؤاخذنا ان نسینا او
اخطانا ربنا ولا تحمل علینا اصرا کما حملته علی الذین من قبلنا
ربنا ولا تحملنا ما لا طاقة لنا به واعف عنا واغفرلنا وارحمنا
انت مولنا فانصرنا علی القوم الکفرین ۝ سبحنک لا علم لنا الا ما
علمتنا انک انت العلیم الحکیم ۝ واخر دعونا ان الحمد لله رب
العلمین ۝ الذی بعزته وجلاله تتم الصالحات هذا والسلام علی من
اتبع الهدی۔

خاکسار
مناظر احسن گیلانی

[illegible]

اصحابِ کہف

جدید تحقیق کی روشنی میں

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی

اصحاب کہف کے غار میں

اس مسئلہ میں علماء اور محققین کی آراء بہت مختلف رہی ہیں کہ اصحاب کہف کا وہ غار جس میں وہ تین سو سال سے زیادہ سوتے رہے، کس جگہ واقع ہے؟ بعض حضرات نے اس کی جگہ ترکی کے شہر افسس میں بتائی ہے، بعض نے اندلس کے ایک غار کو اصحاب کہف کا غار قرار دیا ہے، بعض نے کہا ہے کہ وہ اردن میں واقع ہے، بعض کا کہنا ہے کہ شام میں ہے اور بعض کا خیال ہے کہ وہ یمن میں ہے۔ لیکن اردن کے ایک محقق محمد تیسیر ظبیان صاحب، جو وہاں کے رسالے "الشریعہ" کے ایڈیٹر تھے ۱۹۶۹ء میں پاکستان تشریف لائے تو حضرت والد ماجد قدس سرہ سے ملاقات کے لئے دارالعلوم بھی تشریف لائے۔ اس وقت انہوں نے بڑے جزم اور وثوق کے ساتھ بتایا کہ یہ غار حال ہی میں عمان کے قریب ایک پہاڑ پر دریافت ہوگیا ہے۔ انہوں نے ذکر کیا کہ میں نے اس کی تحقیق کے لئے ایک مقالہ بھی لکھا ہے۔ جو دلائل و قرائن اس وقت انہوں نے ذکر کئے ان کے پیش نظر یہ بات بہت قریب قیاس معلوم ہوتی تھی کہ غالباً اصحاب کہف کا یہ غار وہی ہوگا۔

اس وقت سے اس مقام کو دیکھنے کی خواہش تھی جو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دس سال بعد آج پوری ہوئی۔ تیسیر ظبیان صاحب کا تو اب انتقال ہو چکا تھا، لیکن وہ اپنی تحقیق کے نتائج ایک مفصل کتاب میں محفوظ کر گئے ہیں جو "موقع اصحاب الکہف" کے نام سے دارالاعتصام نے شائع کردی ہے۔

"اصحاب کہف" کا واقعہ قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے، اور اسی واقعے کی وجہ سے قرآن کریم کی ایک پوری سورت کا نام "سورۃ الکہف" ہے۔ "کہف" عربی زبان میں غار کو کہتے ہیں اور واقعہ یہ ہوا تھا کہ ایک بت پرست بادشاہ کے زمانے میں کچھ نوجوان دین توحید پر ایمان لے آئے تھے اور شرک و بت پرستی سے بیزار تھے۔ بت پرست بادشاہ اور اس کے کارندوں نے ان پر ظلم و ستم توڑنے شروع کئے، لہٰذا یہ لوگ بستی سے فرار ہو کر ایک غار میں مقیم ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر گہری نیند مسلط فرمادی اور یہ سالوں تک پڑے سوتے رہے۔ غار کا محل وقوع ایسا تھا کہ سورج کی روشنی اور ہوا تو بقدر ضرورت اندر پہنچتی تھی لیکن دھوپ کسی وقت اندر نہیں آتی تھی۔ کئی

سال گزرنے کے بعد بت پرست بادشاہ کی حکومت ختم ہو گئی اور اس کی جگہ ایک موحد اور صحیح العقیدہ نیک بادشاہ برسرِ اقتدار آ گیا۔ اس کے زمانے میں یہ لوگ اپنی نیند سے بیدار ہوئے۔ بھوک لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے میں سے ایک ساتھی کو سکے دے کر شہر بھیجا اور یہ تاکید کی کہ خفیہ طریقے پر جا کر کوئی حلال کھانا خرید لائے۔ وہ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ ابھی تک اسی بت پرست بادشاہ کا زمانہ ہے اس لئے خطرہ تھا کہ اگر ان لوگوں کا پتہ انہیں معلوم ہو گیا تو وہ ظلم و ستم میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ چنانچہ یہ صاحب چھپتے چھپاتے بستی میں پہنچے اور ایک نان بائی کی دکان سے کھانا خریدنا چاہا لیکن جب سکہ اس کے حوالے کیا تو وہ بہت پرانے زمانے کا تھا جس سے سارا راز کھل گیا۔ انہیں یہ معلوم ہو کر اطمینان ہوا کہ حکومت بدل چکی ہے۔ چنانچہ بادشاہ وقت کو بھی اطلاع پہنچی اور ان صاحب نے اپنے ساتھیوں کو بھی نئے حالات کی اطلاع دے دی۔

قرآن کریم نے اجمالی طور پر مذکورہ بالا واقعہ بیان کرنے کے بعد یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ اس دور کے لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے ان نیک بندوں کی قدر دانی کے طور پر ان کے غار پر ایک مسجد بھی تعمیر کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

قرآن کریم نے اپنے عام اسلوب کے مطابق اس واقعے کی تاریخی اور جغرافیائی تفصیلات بیان نہیں فرمائیں کہ یہ واقعہ کس دور میں اور کہاں پیش آیا؟ چنانچہ تاریخی روایات کی بنیاد پر مفسرین اور مورخین نے اس سلسلے میں مختلف آراء ظاہر کی ہیں۔ زیادہ تر محققین کا رجحان یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عروج آسمانی کے کچھ ہی عرصہ بعد پہلی سے تیسری صدی عیسوی تک کا ہے۔ اس وقت اس علاقے پر سخت بت پرست بادشاہوں کی حکمرانی تھی لیکن رفتہ رفتہ دین عیسوی جو فلسطین کے علاقے میں ظاہر ہوا تھا اس کے اثرات یہاں تک پہنچ رہے تھے۔ اسی کی بنا پر یہ نوجوان اس دین کے حلقہ بگوش ہوئے۔ پھر جس زمانے میں یہ سعید روحیں غار میں محو خواب تھیں اس دوران میں رفتہ رفتہ دین عیسوی کے پیروکار اس علاقے کو مشرک حکمرانوں سے آزاد کرا کر اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور یہاں کے باشندوں نے بھی دین عیسوی قبول کر لیا۔

پھر جب نیند سے بیدار ہونے کے بعد ان حضرات کو بدلے ہوئے حالات معلوم ہوئے تو

اگرچہ انہیں دین برحق کی نشر و اشاعت سے خوشی ہوئی لیکن انہوں نے اپنے لئے یہی پسند کیا کہ دنیا کے ہنگاموں سے الگ اسی غار میں اپنی باقی زندگی گزار دیں۔ لوگوں نے اصرار بھی کیا کہ وہ اب شہر میں آ جائیں لیکن وہ آمادہ نہ ہوئے اور اپنی باقی زندگی اسی غار میں گزار دی۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بادشاہ وقت ان کا حال معلوم کر کے ان کی زیارت کے لئے غار میں پہنچا تو ان کا انتقال ہو چکا تھا لیکن دوسری روایات میں ان کی وفات کے بارے میں خاموشی ہے۔

مسیحی مصادر میں بھی یہی قصہ معمولی فرق کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے اس واقعہ کی تفصیلات ۵۲۱ء میں ساروغ (عراق) کے ایک کاہن نے جس کا نام یعقوب (یا جیمس) تھا، ایک مفصل مقالے میں لکھی تھیں۔ یہ مقالہ سریانی زبان میں تھا۔ پھر اس کے یونانی اور لاطینی ترجمے ہوتے رہے۔ اس کے بیان کے مطابق یہ واقعہ ۲۵۰ء میں ایشیائے کوچک کے شہر افسس میں پیش آیا تھا۔ ان نوجوانوں کی تعداد سات تھی اور یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا پیغام دنیا کو سنا کر دوبارہ اسی غار میں سو گئے۔ ❶

چونکہ یعقوب ساروغی نے ان کے بارے میں "دوبارہ سونے" کا لفظ استعمال کیا تھا اس لئے بہت سے لوگوں کا اعتقاد یہی رہا ہے کہ اصحاب کہف ابھی تک زندہ ہیں اور قیامت کے قریب دوبارہ اٹھیں گے۔

مسیحی مصادر میں تقریباً جزم کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ ترکی کے شہر افسس کے قریب پیش آیا تھا (جس کا اسلامی نام طرسوس ہے) اور وہیں پر ایک غار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اصحاب کہف کا غار ہے۔ شاید انہی مسیحی روایات کے زیر اثر بہت سے مسلمان مفسرین اور مورخین نے بھی اصحاب کہف کا محل وقوع افسس ہی کو بتایا ہے۔ تاہم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت تفسیر ابن جریر میں مروی ہے جس میں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ اصحاب کہف کا غار ایلہ (خلیج عقبہ) کے قریب (یعنی اردن میں) واقع ہے۔ اس روایت اور متعدد دوسرے قرائن کی بنیاد پر آج دور کے بہت سے محققین نے اسی کو ترجیح دی ہے

❶ "موقع اصحاب الکہف" مولانا تیسیر ظبیان ص ۳۹ مطبوعہ قاہرہ

قرآنی شواہد ملتے چلے گئے جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) اس غار کا دہانہ جنوب کی طرف ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس پر قرآن کریم کی آیت پوری صادق ہے۔

وتری الشمس اذا طلعت تزاور عن کھفھم ذات الیمین واذا غربت تقرضھم ذات الشمال وھم فی فجوۃ منہ۔[۱۲]

"اور تو دیکھے گا سورج کو جب وہ طلوع ہوتا تو ان کے غار سے دائیں جانب جھک کر گزرتا اور جب غروب ہوتا تو ان کے بائیں جانب کترا کر گزرتا اور یہ لوگ اس غار کے کشادہ حصے میں تھے"

اس غار میں صورتحال یہی ہے کہ دھوپ کسی وقت اندر نہیں آتی بلکہ طلوع و غروب کے وقت دائیں بائیں سے گزر جاتی ہے اور غار کے اندر ایک کشادہ فلا بھی ہے جس میں ہوا اور روشنی آرام سے پہنچتی ہے۔

(۲) قرآن کریم نے یہ بھی ذکر فرمایا ہے کہ بستی کے لوگوں نے اس غار کے اوپر مسجد بنانے کا ارادہ کیا تھا چنانچہ اس غار کے ٹھیک اوپر کھدائی کرنے اور ملبہ ہٹانے کے بعد ایک مسجد بھی برآمد ہوئی ہے۔ جو قدیم رومی طرز کے پتھروں سے بنی ہوئی ہے ماہرین آثار قدیمہ کا کہنا ہے کہ یہ پتھروں سے بنی ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ شروع میں بازنطینی طرز کا ایک معبد تھا اور عبدالملک بن مروان کے زمانے میں اسے مسجد بنا دیا گیا۔

(۳) عصر حاضر کے بیشتر محققین کا کہنا یہ ہے کہ وہ مشرک بادشاہ جس کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر اصحاب کہف نے غار میں پناہ لی تھی ٹراجان تھا جو ۹۸ء سے ۱۱۷ء تک حکمران رہا ہے اور اس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ بت پرستی سے انکار کرنے والوں پر سخت ظلم ڈھاتا تھا۔ تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ ٹراجان نے ۱۰۶ء میں شرق اردن کا علاقہ فتح کر لیا تھا اور اسی نے عمان کا وہ شہر تعمیر کیا تھا جس کا ذکر پیچھے آ چکا ہے اور وہ بادشاہ جس کے عہد میں اصحاب کہف بیدار ہوئے اس کا نام جدید محققین تھیوڈوسس بتاتے ہیں جو پانچویں صدی کے آغاز میں گزرا ہے۔

دوسری طرف اس نئے دریافت شدہ غار کے اندر جو سکے پڑے ہوئے ملے ہیں ان میں